MAUL - 603

ایم.اے.اُردو

سمسٹرسوم

MASTER OF ARTS (URDU)

THIRD SEMESTER

مثنوی

MASNAVI

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

ایم.اے.اُردو

MASTER OF ARTS (URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر سوم

THIRD SEMESTER

ایم.اے.یو.ایل – ۶۰۳ – مثنوی

MAUL - 603 - MASNAVI

اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر او. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش (ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز (SOH) اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور، اُتر پردیش۔

ڈاکٹر شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر پی. ڈی. پنت، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر وایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

C جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُترا کھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے ایم. اے. اُردو سالِ دوم، سمسٹر سوم، مثنوی کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypass)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

پیش لفظ

اُتراکھنڈاوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی ورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''ماسٹر آف آرٹ'' کے تحت ''ایم.اے. اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایم.اے. اردو سالِ دوم، سمسٹر سوم، مثنوی کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۸/اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خودتدریسی مواد{SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تا کہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تا کہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

ایم.اے.اُردو

(M.A.URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر سوم

THIRD SEMESTER

ایم.اے. یو.ایل - ۶۰۳ - مثنوی

MAUL - 603, MASNAVI

اکائی نمبر مضمون	مضمون نگار	صفحہ
بلاک نمبر 01:		**5**
اکائی 1 مثنوی : تعریف، آغاز وارتقا	ڈاکٹر اختر علی	6
اکائی 2 مثنوی کا فن	محمد افضل حُسین	21
اکائی 3 دکنی مثنویات کا جائزہ	پروفیسر آفاق حُسین صدیقی	38
اکائی 4 شمالی ہند کی مثنویات کا جائزہ	پروفیسر آفاق حُسین صدیقی	56
بلاک نمبر 02:		**72**
اکائی 5 مُلّا وجہی: مثنوی قطب مشتری	پروفیسر آفاق حُسین صدیقی	73
اکائی 6 میر حسن: مثنوی سحر البیان	ڈاکٹر اختر علی	93
اکائی 7 پنڈت دیا شنکر نسیم: مثنوی گلزارِ نسیم	ڈاکٹر اختر علی	109
اکائی 8 مرزا شوق لکھنوی: مثنوی زہرِ عشق	محمد افضل حُسین	124

بلاک نمبر 01

اکائی 01	مثنوی:تعریف،آغاز وارتقا	ڈاکٹر اختر علی
اکائی 02	مثنوی کا فن	محمد افضل حُسین
اکائی 03	دکنی مثنویات کا جائزہ	پروفیسر آفاق حُسین صدیقی
اکائی 04	شمالی ہند کی مثنویات کا جائزہ	پروفیسر آفاق حُسین صدیقی

اکائی 01 مثنوی : تعریف، آغاز وارتقا

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : مثنوی کی تعریف، اقسام اوراس کے اجزائے ترکیبی

01.04 : مثنوی کا فن

01.05 : مثنوی کا آغاز واِرتقا (جنوبی ہند میں)

01.06 : مثنوی کا آغاز واِرتقا (شمالی ہند میں)

01.07 : مثنوی (دورِ جدید میں)

01.08 : خلاصہ

01.09 : فرہنگ

01.10 : سوالات

01.11 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

زیرِ نظر اکائی میں آپ اردو مثنوی نگاری کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ آپ مثنوی نگاروں سے متعلق گفتگو کرسکیں۔ مثنوی کی تعریف، اس کی اقسام اوراس کے اجزائے ترکیبی کے ساتھ ساتھ مثنوی کا آغاز کہاں سے ہوااوراس نے کس طرح اِرتقا کا سفر طے کیا اس سے بھی آپ کو واقف کرایا جائے گا۔ مثنوی کے فن اوراس کے خصوصیات کا بھی مطالعہ آپ اس اکائی میں کریں گے۔ آخر میں مکمل اکائی کا خلاصہ پیش کیا جائے گا۔ نمونۂ امتحانی سوالات، فرہنگ اور معاون کتب سے بھی آگاہی حاصل ہوگی۔ اکائی کے مطالعے کے دوران جو سوالات دیئے گئے ہیں ان کے جواب آپ اکائی کے آخر میں ملاحظہ کریں گے۔

01.02 تمہید

اُردو کی دیگر شعری اصناف جیسے غزل، مرثیہ، قصیدہ اور رباعی وغیرہ کی طرح مثنوی بھی شاعری کی بہت اہم اور مشہور صنف سخن ہے جس کو زمانۂ قدیم سے غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی۔ اس کو ہر دور کے ہر طرح کے شاعر نے اپنی شاعری کے لئے منتخب کیا۔ مختلف موضوعات پر مشتمل یہ صنف نہایت کارآمد سمجھی جاتی رہی ہے۔

اس کو بیانیہ شاعری کے لئے سب سے اہم سمجھا گیا کیوں کہ شاعر خیالات اور جذبات کو اس میں تفصیل کے ساتھ بیان کرسکتا ہے۔ اس میں کسی کہانی یا قصے کو بیان کیا جاتا ہے مگر اس کے ساتھ شعرا نے اخلاق اور پند ونصائح کے کام بھی سے اس سے لیے ہیں۔ دوسری اصناف کی طرح اس کے بھی کچھ جزو ہوتے ہین جن کے ذریعے مثوی نگار مثنوی تخلیق کرتا ہے۔

آیئے اب مثنوی نگاری کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کریں۔

01.03 مثنوی کی تعریف، اقسام اور اس کے اجزائے ترکیبی

مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے۔ جو لفظ ''مثنیٰ'' سے بنا ہے مگر یہ عربوں کی ایجاد نہ ہوکر ایرانیوں کی اختراع ہے۔ یعنی یہ عربی شاعری کے بجائے فارسی شاعری سے اردو زبان میں آئی۔ عربی میں ''مثنیٰ'' کے معنی ''دو'' کے ہیں۔ یعنی اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعہ ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ دیگر اشعار کے قافیہ سے مختلف ہوتا ہے اس لئے اسے مثنوی کا نام دیا گیا۔

قصیدہ ایک قدیم ترین صنفِ سخن ہے۔ یہ قدیم ترین ہی نہیں مشکل ترین صنف بھی ہے۔ عربی سے یہ فارسی میں منتقل ہوئی۔ ڈاکٹر ایم کمال الدین نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''عربوں کی فیاضی، مہمان نوازی، بہادری، دلیری، کبر و غرور، نسلی تعصب، شراب نوشی، قتل و غارت گری اور عشق و عاشقی عدیم المثال تھی۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو قصائد کی جان ہیں۔ ان کی زندگی سادہ اور بے تکلف تھی۔ آرائش و زیبائش سے احتراز کرتے تھے۔ شادی بیاہ اور دوسرے رسوم میں بھی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ اس کی خاص وجہ غربت بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ یہی اس ماحول کی جھلکیاں ہیں جن میں قصیدے نے جنم لیا اور ترقی طے کر کے دنیا کی عظیم الشان صنف شاعری بن گئی۔''

ریگستانی زندگی مصائب سے پُر تھی۔ عموماً نخلستانوں یا پانی کے کنوؤں کے اردگرد لوگ آباد ہوا کرتے تھے''۔

اصطلاح میں ہیئت کے لحاظ سے مثنوی ایسی صنف سخن اور مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس شعر مین دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جائے لیکن پوری نظم ایک ہی بحر میں ہو۔ ڈاکٹر گیان چند کے مطابق:

> ''مثنوی نظم کا وہ پیکر ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں لیکن ہر شعر کے بعد قافیہ بدلتا جاتا ہے، دو دو ہم قافیہ مصرعوں کی رعایت سے اس کا نام مثنوی طے پایا۔ بنیادی طور پر مثنوی ایک ہیئت کا نام تھا لیکن روایت نے اس کے ہیولیٰ کا تعیّن کر دیا۔''

موضوعاتی لحاظ سے مثنوی کو کئی خانوں میں رکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح اس کی کئی قسمیں ہوجاتی ہیں۔ اس کے مضامین بے حد متنوع ہیں۔ اس میں جس طرح کے جو مضمون چاہیں ادا کر سکتے ہیں۔

نارنگ صاحب نے موضوعاتی اعتبار سے اردو مثنویوں کی چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے، ان کے مطابق:

﴿۱﴾ **مذہبی مثنویاں:**۔ مثلاً رامائن از جگن ناتھ خوشتر، مہابھارت از طوطا رام

﴿۲﴾ **تاریخی مثنویاں:**۔ مثلاً علی نامہ از نصرتی، فتح نامہ ٹیپو سلطان از حسن علی طرب

﴿۳﴾ **معاشرتی مثنویاں:**۔مثلاً فائز اور شیر علی افسوس کی مثنوی ہولی کی تعریف میں

﴿۴﴾ **وہ مثنوی جو ہندوستانی موسم کی عکاسی کرتی ہیں**۔مثلاً سوداؔ کی مثنوی گرمی کے بیان میں، میر کی مثنوی در مذمت برشگال۔

﴿۵﴾ **وہ مثنویاں جو حب الوطنی کے جذبات پر مبنی ہیں**، مثلاً حضرت شاہ مراد کی مثنوی ''در بیان لاہور'' یا محمد بخش شہید کی مثنوی لکھنؤ کی تعریف میں وغیرہ۔

﴿۶﴾ **ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں** جن کا پس منظر لوک کتھا، نیم تاریخی قصے اور پورانک کتھائیں ہیں۔

مثنوی کے اجزائے ترکیبی عام طور پر مندرجہ ذیل ہوتے ہیں:

﴿۱﴾ توحید ﴿۲﴾ مدح حاکم ﴿۳﴾ تعریف شعر وسخن ﴿۴﴾ سبب تالیف ﴿۵﴾ اصل قصہ

﴿۱﴾ **توحید:**۔اس میں حمد ونعت، منقبت اور مناجات کا بیان کیا جاتا ہے۔حمد میں اللہ تعالیٰ کی تعریف، نعت میں حضور اکرم ﷺ کی تعریف، منقبت میں صحابۂ کرام کی تعریف وتوصیف اور مناجات میں خدائے تعالیٰ سے التجا کا ذکر کیا جاتا ہے۔

﴿۲﴾ **مدح حاکم:**۔اس میں بادشاہِ وقت، امرا، رؤسا یا حاکم کی مدح بیان کی جاتی ہے۔

﴿۳﴾ **تعریف شعر وسخن:**۔اس میں شاعر شعر وشاعری یا خامہ سرائی سے متعلق بیان کرتا ہے ساتھ میں اپنی بڑائی اور سخن فہمی کی بھی تعریف کرتا ہے۔

﴿۴﴾ **سبب تالیف:**۔اس میں قصّے کو بیان کرنے کی اصل وجہ کا ذکر ہوتا ہے۔

﴿۵﴾ **اصل قصہ:**۔مثنوی نگار قصہ میں جس واقعہ یا قصہ کو پیش کرنا چاہتا ہے اس کا بیان کرتا ہے۔

01.04 مثنوی کا فن

مثنوی ایک وسیع اور نہایت اہم صنف سخن ہے۔بلحاظ قافیہ وردیف مثنوی کا ہر شعر جداگانہ حیثیت کا حامل ہوتا ہے مگر مضمون سلسلہ وار چلا جاتا ہے۔اس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی اس لئے اس کو چھوٹی اور بڑی دونوں بحروں میں لکھا جاتا ہے۔اردو میں بے شمار مثنویاں ایسی بھی ہیں جن میں اشعار کی تعداد سیکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے۔مثنوی میں کسی داستان یا قصہ یا پھر کسی اہم واقعہ یا معاملہ کو بیان کیا جاتا ہے۔اس میں واقعاتی ربط وتسلسل پایا جاتا ہے۔مثنوی میں حقیقی اور غیر حقیقی و مافوق الفطرت عناصر کا ذکر کیا جاتا ہے۔عام انسانوں کے حسن وعشق کی وارداتوں اور ان کے جذبات واحساسات کی کیفیتوں کی عکاسی اس میں بخوبی پائی جاتی ہے۔خوشی وغم ہجر ووصال، میدانِ جنگ کے ہنگاموں، شادی اور موت کی رسموں، قوموں کی بود وباش، رہن سہن کا ذکر، تہذیب وثقافت کے نمونے اور طرزِ معاشرت کا ذکر مثنوی میں تفصیل کے ساتھ کیا جاتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ زندگی کی بدلتی قدروں کو بھی مثنوی میں جگہ دی گئی ہے۔

اب اخلاق، قومی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی، سماجی مسائل کو بھی اس صنف کے ذریعہ پیش کیا جاتا ہے۔مثنوی اپنی جامعیت کے لحاظ سے جملہ اصنافِ سخن میں ایک جامع اور مکمل حیثیت رکھتی ہے۔اس میں غزل کا سا سوز وگداز، حسن وعشق کی بے چینیاں اور واردات، رزم وبزم کے ہنگامے موجود ہوتے ہیں۔مثنوی اپنے تسلسلِ بیان اور واقعہ نگاری کے اسلوب کو سادگی اور زبان کی صفائی کے ساتھ ایک امتیازی شان کا درجہ رکھتی ہے۔مثنوی کے فن میں آسانی اور وسعت کی وجہ یہ ہے کہ اس کا ہر شعر الگ ہوتا ہے۔اسی وجہ سے دیگر اصناف سخن کی طرح یہ پابند نہیں

ہوتی کہ پوری نظم ایک ہی قافیہ میں ہو۔اسی لئے اس میں اشعار کی گنتی بھی کوئی ضروری چیز نہیں رہ جاتی۔مضامین کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ صوفیانہ،فلسفیانہ،عشقیہ،رزمیہ، بزمیہ، واقعہ نگاری اور محاکات مثنوی میں پیش کیے جاتے رہے ہیں۔

اردو کی اصناف شاعری میں شاید غزل کے بعد سب سے زیادہ کارآمد اور مفید و مقبول صنف مثنوی ہی رہی ہے۔اس میں شاعر کو تنگیِ داماں کی شکایت نہیں رہتی۔کسی بھی طرح کے خیالات اور کتنی ہی وسعت کے معاملات ہوں،مثنوی اپنے دامن میں سب کو سمیٹنے کی قدرت رکھتی ہے۔وسعتِ بیان کی گنجائش مثنوی میں سب سے زیادہ نظر آتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا مثنوی ہی کے ذریعے ہوئی۔

مثنوی کے فن اور اس کی خوبیوں سے قائل مولانا الطاف حسین حالؔی لکھتے ہیں:

''مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے کیوں کہ غزل اور قصیدہ میں اس وجہ سے کہ اوّل سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے، ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔''

اسی طرح مولانا شبلی مثنوی کے متعلق فرماتے ہیں:

''یہ صرف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔''

تہذیبی اور تمدنی تاریخ اور اس کے اِرتقا کو سمجھنے میں مثنوی بڑی مدد کرتی ہے۔اس میں پیش کیے جانے والے واقعات، کردار اور اس عہد کے رسم و رواج کے ذریعے انسانی تہذیب کے مختلف مراحل کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔مثنوی کے اشعار میں ربط وضبط رہنا ضروری ہوتا ہے کیوں کہ اس سے واقعاتی تسلسل کو قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے اور جو مثنوی کی دل چسپی بنائے رکھنے میں مدد کرتی ہے۔کرداروں میں ہم آہنگی اور ایک دوسرے کے ساتھ ان کا مربوط رہنا مثنوی کے فن کے لئے ضروری ہے۔کرداروں کی پیش کش مثنوی کے فنی معیار کو قائم رکھنے میں مدد کرتی ہے۔مثنوی کی اجزائے ترکیبی عام طور پر توحید و مناجا، مدحِ حاکم ،تعریفِ شعر و سخن، سببِ تالیف اور اصل قصہ ہوتے ہیں۔اس میں سب سے اہم حصہ اصل قصہ کا ہے۔ایک اچھی مثنوی کے لئے اس کے قصے کو فنی اعتبار سے بلند و بالا ہونا چاہیے۔قصہ کو کس طرح سے بہترین بنایا جائے اس کے لئے اس میں پلاٹ کی تعمیر اور اس کی کردار نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری اور زبان و بیان پر خاص دھیان دینا چاہیے۔

مثنوی میں پلاٹ کی تعمیر ایسی ہونی چاہیے کہ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ از خود نکل آئے جن ضمنی واقعات کی مدد سے قصہ آگے بڑھتا ہے اس میں ایک منطقی ربط و تسلسل رہنا چاہیے۔ساتھ ہی جزئیات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔کردار نگاری میں ہر کردار اپنی خوبی اور خامی دونوں اعتبار سے اپنے فطری انداز میں موجود ہو۔کرداروں کی فطرت کے لحاظ سے ان کے جذبات و احساسات کی عکاسی ہونی چاہیے کہ جو اس کے مزاج و مقام کے اعتبار سے اس کے منافی ہو۔منظر کشی میں حقیقی انداز ہو، مبالغہ اور بناوٹ پن سے عاری ہو۔کسی بھی چیز کو دل چسپی اور فنی بلندی عطا کرنے میں زبان اور اس کا اندازِ بیان خاص اہمیت رکھتا ہے۔اس لئے پرشکوہ الفاظ اور ان کا بلند آہنگی کے ساتھ معیاری استعمال مثنوی کی فنی خصوصیات میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

01.05 مثنوی کا آغاز و اِرتقا (جنوبی ہند میں)

رباعی کی طرح مثنوی بھی ایرانیوں کی ایجاد ہے۔اس کا آغاز فارسی زبان سے ہوتا ہے اور فارسی سے ہی یہ اردو میں آئی۔ایران میں رودکی کی مشہور مثنوی ''کلیہ ودمنہ'' کا شمار فارسی کی قدیم ترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔رودکی کے بعد بہت سے فارسی شعرا نے مثنویاں لکھیں۔

ان میں دوایسی مثنویاں بھی تحریر ہوگئیں جو دنیائے ادب میں آج بھی زندہ جاوید سمجھی جاتی ہیں۔ایک فردوسی کی ''شاہنامہ'' اور دوسری رودکی ''مثنوی معنوی'' ہے۔ان کے علاوہ نظام گنجوی کا ''خمسہ'' جو کہ پانچ مثنویوں کا مجموعہ ہے۔امیر خسرو کا ''خمسہ'' جو کہ نظام گنجوی کی مثنویوں کے جواب میں ہے۔ان کا شمار بھی اہم مثنویوں میں کیا جاتا ہے۔علاوہ ازیں سعدی شیرازی اور مولانا جامی کا شمار بھی فارسی مثنوی نگاروں میں کیا جاتا ہے۔

اردو میں مثنوی نگاری کی اِبتدا دکن سے ہوئی۔دکن کا پہلا مثنوی نگار فخر الدین نظامی ہے۔اس کی مثنوی کا نام ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے جو بہمنی دَور میں ۱۴۲۱ء سے ۱۴۳۵ء کے درمیان تصنیف کی گئی۔اس میں راجا کدم راؤ اور اس کے وزیر پدم راؤ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔اس مثنوی کی اہمیت نہ صرف تاریخی ہے بلکہ اِس میں اُس دور کے رسم ورواج، اخلاق وعادات، توہمات واعتقادات اور تہذیب ومعاشرت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اس میں ہندو اور مسلم دونوں کی فضا بندی کی گئی ہے۔اس لئے اس فضا خالصتاً ہندوستانی ہے۔

بہمنی دَور میں دکنی اردو کی دوسری قدیم مثنوی ''نوسرہار'' ہے۔جو اشرف بیابانی کی تحریر کردہ ہے۔اس مثنوی میں حضرت امام حسین کی مصیبتوں کا بیان کیا گیا ہے۔اس کا موضوع مذہبی ہے۔یہ مثنوی ۱۵۰۳ء کے قریب لکھی گئی۔اس مثنوی کو نو باب اور بیس قصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔واقعاتِ کربلا کو پیش کرنے میں اشرف نے تاریخی حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے زیبِ داستان کے لئے بہت کچھ بڑھا دیا ہے۔یہ مثنوی لسانی اعتبار سے اہم مانی جاتی ہے۔اس عہد میں میراں جی شمس العشاق نے بھی کچھ مثنویاں تحریر کیں۔''خوش نامہ، خوش نغز، شہادت الحقیقت، مغز مرغوب اور چہار شہادت'' میں انہوں نے اسرار ورُموز کو اپنی مثنویوں کا موضوع بنایا اور تصوّف ومعرفت کے مسائل بیان کیے۔ان کی زیادہ تر مثنویاں سوال وجواب کے انداز میں ہیں۔

بہمنی سلطنت کے ٹوٹنے سے پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔ان میں بیجاپور میں عادل شاہی، گول کنڈہ میں قطب شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، بیدر میں بریدشاہی اور برار میں عمادشاہی کی حکومیں قائم ہوئیں۔ان میں عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں نے زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔بیجاپور کی سلطنت ۱۴۹۰ء میں قائم ہوئی۔اس کے اولین شعری کاوشوں میں برہان الدین جانم کا نام آتا ہے جو میراں جی شمس العشاق کے بیٹے اور مشہور صوفی بزرگ تھے۔انہوں نے اپنے والد کی طرح عوام اور اپنے مریدوں کی رشد وہدایت کے واسطے چند مثنویاں تحریر کیں۔''ارشادنامہ'' ان کی سب سے طویل مثنوی ہے۔

اس کے علاوہ ''وصیت الہادی، حجت البقا، منفعت الایمان، نسیم الکلام'' ان کی مثنویوں کے نام ہیں۔ابراہیم عادل شاہ ثانی (جس کو ''جگت گرو'' کہا گیا) کے زمانے میں اس کے درباری شاعر عبدل نے ''ابراہیم نامہ'' کے نام سے مثنوی لکھی۔جس کا موضوع خود بادشاہِ وقت اور اس دَور کی طرزِ معاشرت ہے۔اس کی سن تصنیف ۱۶۰۳ء ہے۔یہ ایک تاریخی مثنوی ہے۔اس مثنوی میں تخیّل کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی بھی پائی جاتی ہے۔پروفیسر اشرف رفیع اس مثنوی کو عادل شاہی دور کی پہلی ادبی مثنوی مانتے ہیں۔

شاہ ابوالحسن قادری کی ''سکھ انجن'' محمد عاجز کی ''یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں'' بھی قابل ذکر مثنویاں ہیں۔سکھ انجن اپنے رمزیاتی اور ایمائی اسلوب کی وجہ سے اور یوسف وزلیخا ولیلیٰ مجنوں اپنے رومانی انداز کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہیں۔عادل شاہی دور میں مقیمی، رستمی اور نصرتی مشہور شعرا گزرے ہیں۔ان کی وجہ سے بیجاپور علم وادب کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا ان شعرا نے زبان وادب کی خدمت کرتے ہوئے کئی اہم

مثنویاں تحریر کیں۔ مقیمی کی مشہور مثنوی کا نام ''چندر بدن ومہیار'' ہے۔جس میں ایک حقیقی قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نصیرالدین ہاشمی کے مطابق اس کی تصنیف ۱۰۵۰ھ میں عمل میں آئی۔ ''چندر بدن اور مہیار'' ایک عشقیہ مثنوی ہے۔جس کے قصہ کی بنیاد کدری کوٹہ کے قصہ پر رکھی گئی ہے۔ مقیمی نے اس قصے کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ شروع سے آخر تک دل چسپی قائم رہتی ہے۔اس میں بڑی سادگی اور بے ساختگی موجود ہے۔اس نے گنجلک اسلوب سے خود کو دور رکھا۔ مقیمی کی شاعری میں فارسی اسلوب کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔

رستمی نے فارسی ''خاورنامہ'' کا ترجمہ دکنی اردو میں ''خاورنامہ'' کے نام سے ہی ۱۰۵۹ھ میں کیا۔ یہ ایک ضخیم مثنوی ہے جو لگ بھگ ۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے ہے جو فرضی قصہ پر مبنی ہے۔اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرکزی کردار کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔اس مثنوی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ باوجود ضخیم ہونے کے اس قصے میں ربط وتسلسل پایا جاتا ہے۔حسن شوقی اس عہد کا ایک سیلانی اور مسلم الثبوت شاعر تھا۔اس نے دو مثنویاں لکھیں۔ایک ''فتح نامہ نظام شاہ اور دوسری میزبانی نامہ'' ہے۔ فتح نامہ نظام شاہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جس میں نظام شاہ اور وجیانگر کے حکمراں رام راج کے درمیان جنگ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔اس مثنوی میں دکن کے بادشاہوں کی بہادری کے علاوہ ان کے مزاج کی افتاد، سخاوت، انصاف وغیرہ کو منظوم کیا گیا ہے۔

اس مثنوی میں فارسی کے اثرات کی کارفرمائی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے اس میں بڑی روانی اور بلند آہنگی نظر آتی ہے۔شوقی کی دوسری مثنوی ''میزبانی نامہ'' کا موضوع سماجی ہے جس میں سلطان محمد عادل شاہ کی شادی کو مرکز نگاہ میں رکھا گیا ہے۔اس میں اس دور کے رسم ورواج اور باہمی ہوتی ہندو مسلم تہذیب کو پیش کیا گیا ہے۔اس میں دکنی اسلوب کی کارفرمائی زیادہ ہے۔نصرتی اس دور کا بڑا شاعر ہے۔اس کا شمار اپنے وقت کے قادرالکلام شاعروں میں ہوتا ہے۔اس نے رزمیہ اور عشقیہ دونوں طرح کی مثنویاں لکھیں۔علی عادل شاہ کے دور میں اس کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا۔اس نے تین مثنویاں ''گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری'' تحریر کیں۔

گلشن عشق کا سن تصنیف ۱۰۶۷ء اور اس کا موضوع عشقیہ ہے۔اس میں کنور منوہر اور مدمالتی کا عشقیہ قصہ بیان ہوا ہے۔علی نامہ اور تاریخِ اسکندری رزمیہ مثنوی ہیں۔علی نامہ میں بادشاہ علی عادل شاہ کے واقعات نظم کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی سات قصائد کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ مثنوی صرف لڑائیوں کی داستان نہیں بلکہ دکنی تہذیب کا ایک نگارخانہ بھی ہے اس مثنوی میں نصرتی نے اس عہد کی تاریخ بڑی چابک دستی سے تحریر کردی ہے۔تاریخِ اسکندری سکندر عادل شاہ کے زمانے پر مشتمل ہے۔اس میں بیجاپور کے انتشار اور زوال کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔نصرتی کی شاعری پر تنقید کرتے ہوئے نصیرالدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''نصرتی کی مثنویاں اور قصائد دیکھنے سے اس کی قادرالکلامی کی خوبی معلوم ہوتی ہے۔ ''گلشن عشق'' میں انسانی جذبات کی جس عمدگی سے ترجمانی کی گئی ہے کہیں اور نظر نہیں آتی۔اس کے کلام کی رنگینی اور تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابلِ داد ہے۔''

بیجاپور کے اس ادبی ماحول میں چند اور بھی شعرا نظر آتے ہیں جنھوں نے مثنوی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ان میں ملک خوشنود، صنعتی، ہاشمی اور امین الدین اعلیٰ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ملک خوشنود نے امیر خسرو کی مثنوی ''ہشت وبہشت'' کا ترجمہ ''جنت سنگھار'' کے نام سے کیا۔ یہ مثنوی لگ بھگ تیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں قصہ در قصہ کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ صنعتی نے ''قصۂ بے نظیر'' کے

نام سے ایک مثنوی تحریر کی جس میں ایک صحابیِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جناب حضرت تمیم انصاری رضی اللہ عنہ سے متعلق داستان نظم کی گئی ہے۔اس میں رزم اور بزم کے ساتھ مناظر قدرت کے نقشے بڑی فن کاری سے پیش کیے گئے ہیں۔ہاشمی عادل شاہی دور کا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔اس نے ۱۰۹۹ھ میں ''یوسف وزلیخا'' کے نام سے مثنوی لکھی۔جو ایک عشقیہ مثنوی اور اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی آئینہ دار ہے۔محمد امین اعلیٰ نے ''نجات نامہ'' کے نام سے مثنوی تحریر کی۔

دکنی ادب کی تاریخ میں گولکنڈہ کا قطب شاہی دور خاصا اہم ہے۔قطب شاہی سلطنت ۱۵۱۸ء میں سلطان قلی قطب شاہ نے قائم کی۔ اس سلطنت کے سلاطین اور شعرا دونوں نے دکنی زبان وادب کی بڑی خدمت کی۔دبستانِ گولکنڈہ کی پہلی مثنوی ''یوسف وزلیخا'' ہے جس کو احمد گجراتی نے ۱۵۸۰ء سے ۱۵۸۴ء کے درمیان تصنیف کیا۔حالاں کہ اس سے قبل فیروز کی ایک مثنوی ''پرت نامہ'' ملتی ہے مگر اس کو غیر معمولی کارنامہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔احمد گجراتی کی دوسری مثنوی ''لیلیٰ مجنوں'' ہے۔ان دونوں مثنویوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے عہد کے تہذیبی مناظر کو بڑے عمدہ ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔مرد وعورت کے لباس، زیورات، آرائش، رہن سہن کے طور وطریقے، سنگار کے سامان ان سب کی تفصیل ان میں پائی جاتی ہے۔ان کو زبان وبیان پر قدرت حاصل تھی۔احمد گجراتی دکنی ادب کا بڑا پاسدار رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مثنویوں میں قدامت پسندی پائی جاتی ہے۔''قطب مشتری'' کو ۱۶۰۹ء میں ملا وجہی نے تصنیف کیا۔اس مثنوی میں بادشاہ قلی قطب شاہ اور اس کی محبوبہ کی عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے۔یہ مثنوی دکن کی بلند پایہ مثنویوں کے ہم پلہ تو نہیں مگر یہ ایک نیم تاریخی حیثیت کی حامل ہے اور اس میں اس زمانے کی تہذیب وتمدن اور طرزِ معاشرت کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔اس میں اس زمانہ کی سماجی کیفیت کا بیان بہت دل چسپ انداز میں موجود ہے۔تشبیہات واستعارات کے بہترین نمونے اس میں پائے جاتے ہیں۔

غواصی سلطان محمد قطب شاہ کے وقت میں ایک ممتاز شاعر تھے۔ان کی تین مثنویاں ''سیف الملوک وبدیع الجمال، طوطی نامہ اور مینا ستونتی'' ہیں۔سیف الملوک وبدیع الجمال ۱۶۲۵ء میں بادشاہ مصر کی داستان بیان ہوئی ہے۔طوطی نامہ میں ضیاء الدین بخشی کی ۴۵ کہانیوں کو ترمیم واضافہ کے ساتھ پیش کیا گیا۔مینا ستونتی ایک پرانی مثنوی میناست کا قدیم اردو یعنی دکنی ترجمہ ہے۔یہ مثنوی سادگی اور واقعہ نگاری کی عمدہ مثال ہے۔غواصی کی مثنویوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک شاعری میں تسلسل، خیالات کی تازگی، طرزِ نو، تخیّل کی بلندی، لطافتِ بیان اور سحر بیانی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔اس میں عورت کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔غواصی کی ایک اور مثنوی طوطی نامہ ہے جس کو ۱۶۳۹ء میں تصنیف کیا گیا۔جس کے بارے میں محمد علی اثر لکھتے ہیں:

> ''طوطی نامہ'' غواصی کی شاہ کار مثنوی ہے، ''مینا ستونتی'' کی طرح مثنوی بھی ہندوستانی قصہ پر مبنی ہے۔ طوطی نامہ میں ایک ایسی کشش موجود ہے جس سے ہر شخص ہر زمانے میں لطف اندوز ہوسکتا ہے۔اس اعتبار سے اس مثنوی کا شمار دنیا کی اعلیٰ ترین ادبی کتابوں میں کیا جاسکتا ہے۔''
>
> (غواصی: شخصیت اور فن..ص..۹۹)

انداز بیان کی سادگی اور جزئیات نگاری کی اعلیٰ مثال ابن نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' میں پائی جاتی ہے۔اس کا سال تصنیف ۱۶۶۵ء ہے۔اس مثنوی کی بنیاد فارسی قصہ ''بساتین الانس'' پر رکھی گئی ہے۔شعری اعتبار سے پھول بن کی سب سے اہم خوبی اس کے اُسلوب

کی سادگی ہے۔فنی اور ادبی اعتبار سے یہ دکنی ادب میں اہم مقام رکھتی ہے۔ابن نشاطی نے ۳۹ رصنعتیں استعمال کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت اس میں فراہم کر دیا ہے۔اس میں لفظی صنائع اور بدائع کا استعمال بہت ہوا ہے۔مناظرِ قدرت اور مختلف واقعات کے جو منظر پیش کیے گئے ہیں اور رزم اور بزم کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ ابن نشاطی کی شعری فن کارانی صلاحیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

طبعی نے مثنوی ''بہرام وگل اندام'' ۱۶۷۰ء میں اپنے عہد کے بادشاہ کے عزائم وفتوحات کا ذکر کیا ہے۔۱۳۴۰/اشعار پر مشتمل اس مثنوی کو طبعی نے چالیس دن میں مکمل کیا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے اس کی دو اہم خصوصیات کا ذکر کیا ہے ایک تو یہ کہ شعریت اور قصہ کے اُتار چڑھاؤ سے اس میں مثنوی کا فن ترقی یافتہ شکل میں نظر آتا ہے۔دوسری یہ کہ مثنوی میں اشعار کی تعداد اور عنوانات کی تقسیم میں ایک باضابطگی ملتی ہے۔اس کے علاوہ اس مثنوی کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس کی زبان اور اُسلوبِ بیان ''ریختہ'' سے قریب تر ہو گیا ہے۔اسی عہد میں احمد جنیدی نے ۱۰۶۴ھ میں مثنوی ''ماہ پیکر'' تخلیق کی جو کہ عشقیہ مثنوی ہے۔مثنوی ''رضوان شاہ روح افزا'' فائز نے تحریر کی۔اشرف رفیع کے مطابق یہ قطب شاہی عہد کی آخری مثنوی ہے۔اورنگ آباد کے شاعروں میں سراج کی ''بوستانِ خیال'' اور لچھمی نرائن شفیق کی ''تصویر جاناں'' بھی بہت اہم مثنویاں ہیں۔

اسی زمانے میں چند مذہبی مثنویاں بھی لکھی گئیں۔مثلاً مختار کی مولود نامہ ۱۶۷۰ء اور معراج نامہ ۱۶۸۲ء، فتاحی کی مولود نامہ ۱۶۷۱ء، ضعیفی کی ہدایت الہندی، خواص کی قصہ حسینی ۱۶۷۹ء، سیوک کی جنگ نامہ محمد حنیف ۱۶۸۱ء وغیرہ ہیں۔دکنی روایت کے مکمل اختتام سے قبل قاضی محمود بحری کی مثنوی من لگن ۱۷۰۰ء، باقر آگاہ کی مثنوی گلزار عشق ۱۷۱۶ء کا ذکر بھی پایا جاتا ہے۔اور وہ اس لئے کہ اس زمانے تک لوگ معیاری اور ٹکسالی زبان کی طرف راغب ہو چکے تھے۔اس کے بعد فراقی نے ''مرآۃ الحشر ۱۷۷۰ء'' کے نام سے مثنوی تحریر کی۔

01.06 مثنوی کا آغاز و اِرتقا (شمالی ہند میں)

جنوبی ہند کی مثنوی نگاری کو جان لینے کے بعد آیئے اب شمالی ہند کی مثنوی نگاری کا جائزہ لیں۔شمالی ہند میں بھی مثنویوں کی تاریخ بڑی طویل ہے۔بارہویں صدی میں ہجری کے آغاز میں شمالی ہند میں اردو شاعری کا آغاز ہوا اور ہمیں اِبتدا ہی سے اچھی مثنویوں کے نمونے ملنے لگتے ہیں۔شمالی ہند کی پہلی مثنوی افضل جھنجھانوی کی ''بکٹ کہانی'' ہے۔جو دراصل ''بارہ ماسہ'' ہے۔

شیخ عبداللہ امین کی مثنوی ''فقہ ہندی'' میں فقہی مسائل بیان کیے گئے ہیں۔''محشر نامہ، درد نامہ، خواب نامہ پیغمبر اور دھیر نامہ بی بی فاطمہ'' کے نام سے چار مثنویاں شیخ جیون نے تحریر کیں۔ان مثنویوں کا تعلق مذہب سے ہے۔جعفر زٹلی کا شمار شمالی ہند کے اہم مثنوی نگاروں میں کیا جاتا ہے۔انہوں نے کئی مثنویاں لکھی ہیں۔''ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر، طوطی نامہ، سیس نامہ، درصفت پیری اور مرثیہ اورنگ زیب'' وغیرہ۔ان میں ظفر نامہ اورنگ زیب طویل مثنوی ہے جس میں اورنگ زیب کی دکنی فتوحات کا بیان ملتا ہے۔

نواب صدرالدین فائز دہلوی کے دیوان میں بھی چھوٹی چھوٹی مثنویاں مل جاتی ہیں۔ان کی تمام مثنویاں مترنم بحروں میں پائی جاتی ہیں۔جن میں مقامی رنگ خاصا نظر آتا ہے۔ان کی کچھ مثنویوں کے نام یہ ہیں ''پنگھٹ، بیان میلا، جوگن، تعریف پنگھٹ، وصف بھینگڑن، تعریف بتولن، در وصف کاچھن'' وغیرہ۔شاہ آیت اللہ جوہری نے ''گوہر جوہری'' نام سے مثنوی تحریر کی۔اس میں مرکزی قصہ کے علاوہ ضمنی قصے بھی موجود ہیں۔یہ ایک المیہ مثنوی ہے جس میں رام راجہ اور کنول دی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔آبرو کے مزاج میں شوخی، ظرافت،

حسن پرستی اور عاشق مزاجی تھی۔اس لئے اسی مزاج کے تحت انہوں نے ایک مثنوی ''درموعظ آرائشِ معشوق'' تخلیق کی۔اس میں انہوں نے اپنے زمانے کی پوشاک، سج دھج اور بانکپن کی تصویر کشی کی ہے۔

شاہ حاتم کے ''دیوان زادہ'' میں پانچ مثنویاں موجود ہیں۔جن کے نام ''ساقی نامہ، وصفِ قہوہ، مثنوی سراپا، وصفِ تمبا کو وحقہ اور مثنوی بہاریہ'' ہے۔آرزؔو نے بھی ''شورِ عشق معروف بہ سوز وساز، مثنوی جوش وخروش اور مثنوی مہروماہ'' تحریر کیں۔سید الولی عزلتؔ نے بھی دو مثنویاں لکھیں ایک ''راگ مالا'' جس میں بارہ سو اشعار پائے جاتے ہیں اور یہ ہندوستانی موسیقی سے متعلق ہے دوسری کا نام ''ساقی نامہ'' ہے جواب نایاب ہے۔

مندرجہ بالا مثنویاں ایک خاص قماش اور انداز میں تحریر کی گئی ہیں لیکن عہد سوؔدا و میرؔ تک آتے آتے اس میں پختگی آنے لگتی ہے اور یہ صنف اِرتقا کے کئی منازل طے کر لیتی ہے۔اب سوؔدا بنیادی طور پر قصیدہ گو شاعر تھے مگر انہوں نے مختلف اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی جس میں مثنوی نگاری بھی شامل ہے۔انہوں نے مختلف موضوعات پر مبنی کل چوبیس مثنویاں لکھی ہیں جن پر قصائد کا انداز حاوی نظر آتا ہے۔اس لئے ان کی زیادہ تر مثنویاں ہجویہ اور مدحیہ انداز اختیار کیے ہوئے ہیں اور اس کی وجہ سے یہ مثنویاں سادگی اور فطری پن سے دور ہو جاتی ہیں۔چوں کہ سوؔدا کی طبیعت کو قصیدہ نگاری سے مناسبت تھی اس لئے وہ غزل اور مثنوی کے ساتھ نہ چل سکے اور مثنوی میں منظر نگاری میں محاکات کے بجائے تخیّل کی بلند پردازی، معنی آفرینی اور مبالغہ سے کام لیا جاتا ہے۔

سوؔدا کی اہم مثنویوں کے نام ''قصہ پسر شیشہ گر وزرگر، ہجو امیر بخیل، ہجو پیل راجہ نرپت سنگھ، تعریف شکار آصف الدولہ، سبیل ہدایت، خط دراشتیاق، مثنوی درشکایت موسم گرما وغیرہ۔سوؔدا کے مقابلے میرؔ کو بہتر مثنوی نگار کہا جا سکتا ہے۔میر نے ہجویہ، مدحیہ اور عشقیہ مثنویاں لکھی ہیں۔ان کی عشقیہ مثنویاں سوؔدا سے بہتر ہیں۔میرؔ کے دیوان میں کل ۳۸ رمثنویاں پائی جاتی ہیں۔جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں ''خواب و خیال، معاملاتِ عشق، دریائے عشق، شعلۂ عشق، مثنوی ننگ ونام، مثنوی گھر کا جال، مثنوی شکارنامہ، مثنوی مرغ بازاں، اژدرنامہ، درتعریف سگ وگربہ'' وغیرہ۔میر کی بیش تر مثنویوں کا تعلق کسی نہ کسی طرح سے ان کی زندگی سے بھی ہے۔ان کی عشقیہ مثنویاں بہت مقبول ہوئیں۔ان میں شدتِ جذبات اور وارداتِ قلبی کی بہترین تصویر کشی ملتی ہے۔

میر سوؔز نے غزلوں کے علاوہ ایک مثنوی بھی لکھی جس کا موضوع عشق ہے۔مگر اس میں سبق آموز اشعار بھی موجود ہیں۔مرزا جعفر علی حسرتؔ کو قصیدہ نگاری اور غزل گوئی میں مہارت حاصل تھی۔انہوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ان کی مشہور مثنوی کا نام ''طوطی نامہ'' ہے۔سوؔدا اور میرؔ کی طرح قائمؔ چاند پوری نے بھی متعدد مثنویاں لکھی ہیں جن کی تعداد ۳۶ رہیں۔ان میں تین طویل مثنویاں بھی شامل ہیں۔ان کی طویل مثنویاں ہی قابلِ مطالعہ ہیں۔''قصہ نٹ'' موسوم بہ ''حیرت افزا'' قصہ شاہ لدھا موسوم بہ عشق درویش'' مثنویاں قابلِ لحاظ ہیں۔عشقِ درویش سے متاثر ہو کر راسخؔ عظیم آبادی نے مثنوی ''اعجازِ عشق'' لکھی۔قائم کی مثنویوں میں ایک خاصا رنگ پایا جاتا ہے۔

سوؔدا و میرؔ کے عہد کے شعرا نے مثنوی نگاری کی جس روایت کو آگے بڑھایا، آنے والے شعرا نے ان سے متاثر ہو کر اردو مثنوی کے وہ قصر تعمیر کیے جو عہد ساز بن گئے۔ان میں میر حسن اور ان کے معاصرین کا دور آتا ہے۔یہ اردو مثنوی کا سب سے سنہرا دور تصور کیا جاتا ہے۔اس دور میں اردو کی کئی اعلیٰ مثنویاں تخلیق کی گئیں جن کی نظیر نہیں ملتی۔اس عہد کے مثنوی نگاروں میں میر اثرؔ، میر حسنؔ، راسخؔ عظیم آبادی، نظیرؔ اکبر

آبادی، مصحفی، جرأت، انشا اور رنگین نہایت اہم ہیں۔ میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' بہت مشہور ہوئی۔ اس مثنوی کا کوئی پلاٹ نہیں ہے۔ اس میں بہت سی حسن وعشق کی داستان بیان کی گئی ہے مگر اس میں جو سراپا اور جذباتِ عشق کی عکاسی کی گئی ہے وہ خاصہ کی چیز ہے۔ اس کی ایک خاص خوبی اس کا انداز بیان بھی ہے۔ ''خواب وخیال'' شمالی ہند کی وہ کامیاب مثنوی ہے جس کی تقلید بعد کے آنے والے شعرا نے بھی کی۔

میر حسن کا نام اردو مثنوی نگاری میں سب سے اہم مانا جاتا ہے۔ انہوں نے مثنوی کے فن کو بامِ عروج عطا کیا۔ انہوں نے ۱۲ر مثنویاں لکھیں جن میں سب سے اہم اور مشہور مثنوی کا نام ''سحر البیان'' ۱۷۸۵ء ہے۔ یہ مثنوی منظر نگاری، جذبات نگاری، جزئیات نگاری، کردار نگاری، سراپا نگاری، مکالمہ نگاری، مرقع نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اس میں بے شمار خوبیاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ یہ اپنے عہد کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں کی بھی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔

اس کی خوبیوں سے متاثر ہو کر محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں لکھتے ہیں:

''اس کی صفائی بیان اور لطافت محاورہ اور شوخیِ مضمون اور طرزِ ادا کی نزاکت اور سوال وجواب کی نوک جھونک توصیف سے باہر ہے۔''

(آبِ حیات)

میر حسن کی دیگر مثنویوں میں ''گلزارِ ارم، رموز العارفین، خوانِ نعمت اور قصرِ جواہر'' اہم ہیں۔ راسخ عظیم آبادی ۱۷ر مثنویوں کے خالق ہیں۔ انہوں نے عشقیہ، مدحیہ، ہجویہ، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات پر مثنویاں لکھیں۔ عشقیہ موضوعات پر ان کی مثنویاں اہم ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کی ''سیر دریا'' مشہور مثنوی ہے۔ مصحفی کی ۲۰ر مثنویوں کا سراغ لگا ہے۔ ان میں ''جذبۂ عشق، گلزارِ شہادت، شعلۂ عشق اور بحر المحبت'' اہم ہیں۔ جرأت کی ۲۱ر مثنویاں دستیاب ہیں۔ جن میں ''کارستانِ الفت'' اور مثنوی ''حسن وعشق'' مشہور ہوئیں۔ انشا نے ۱۱ر مثنویاں اور رنگین نے اس عہد کے مثنوی نگاروں میں سب سے زیادہ ۴۳ر مثنویاں تحریر کیں۔ ان کی مثنویوں میں مثنوی ''دل پذیر'' سب سے بہترین مثنوی مانی جاتی ہے۔ بعض ناقدین اس کو سحر البیان اور گلزار نسیم کے بعد شمالی ہند کی سب سے بہترین مثنوی تسلیم کرتے ہیں۔ میر حسن کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیم اور ان کے معاصرین کا دور آتا ہے۔ اس دور میں مومن، نسیم، ذوق، ضمیر، فصیح، رشک، ناسخ، راحت کاکوروی، مسکین، ہوس، قاضی اختر، عیش وغیرہ مثنوی نگار سامنے آتے ہیں۔

ان مثنوی نگاروں کے فوراً بعد دلگیر، قلق، مرزا شوق، واجد علی شاہ اختر، اسیر، مشیر عالم، صفیر بلگرامی، نساخ، مہر، صہبا وغیرہ شعرا نے بھی مثنویاں لکھیں۔ مثنوی کے رنگِ قدیم کے آخری دور کے مثنوی نگاروں میں تسلیم، جلال، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، داغ دہلوی، شوق قدوائی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ مندرجہ بالا شعرا میں سے کچھ اہم شعرا کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے۔

دیا شنکر نسیم کی سب سے اہم مثنوی کا نام ''گلزارِ نسیم'' ۱۸۴۴ء ہے۔ اس میں مرصع سازی کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جس پر کسی دوسری مثنوی کو فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کی مخصوص خوبیوں میں اختصار، پختگی کلام، تناسبِ لفظی، بندش کی چستی ہے۔ اس میں آمد کے بجائے آورد زیادہ ہے۔ اس مثنوی میں اختصار و معنی آفرینی ہر لحاظ سے نہایت قابلِ قدر ہے۔ ایک شعر میں معنی کے اعتبار سے کئی کئی شعر کے مضامین بھر دیئے ہیں۔ سحر البیان اگر دہلوی تہذیب کی نمائندہ ہے تو گلزارِ نسیم لکھنوی معاشرہ کی شاہ کار ہے۔ نسیم نے اپنی اس مثنوی میں لکھنؤ کے ذوق و

مذاق کی کامیاب نمائندگی کی ہے۔مومنؔ ایک عاشق صادق تھے۔ان کی مثنویوں سے ان کی عاشقی کا پتہ چلتا ہے۔شیفتہؔ نے ''گلشنِ بے خار'' میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔کہ مومنؔ نے محبوباؤں کے درمیان زندگی گزاری۔مومنؔ کا عشق مجازی اور گوشت پوست کے انسان کا ہے۔ان کے کلیات میں کل ۱۲ر مثنویاں ہیں۔ان کی مثنویوں میں ''قولِ غمین'' سب سے اہم مثنوی ہے۔یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس میں معاشقوں کا ذکر ہے۔ان کی مثنویوں کی خاص خوبی جذبات نگاری میں ہے۔

دبستانِ لکھنو کی دوسری نمائندہ مثنوی مرزا شوقؔ کی ''زہرِ عشق'' ہے جس کو غالباً اردو کی سب سے بدنام مثنوی سمجھا جاتا ہے۔اس مثنوی کی خاص خوبی اس کی سراپا نگاری اور جذباتِ عشق کی ترجمانی ہے۔شوقؔ کی مثنویاں وہ پہلی مثنویاں ہیں جن میں کوئی مافوق الفطرت واقعہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔''زہرِ عشق'' کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ میر اثرؔ کی مثنوی ''خواب وخیال'' کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔زہرِ عشق کے زبان و بیان میں غضب کی سلاست اور بلا کی روانی پائی جاتی ہے۔سجاد ظہیر نے اس مثنوی کو اہم ادبی کارنامہ قرار دیا ہے۔شوقؔ کی دو اور مثنویوں کے نام ''فریبِ عشق اور بہارِ عشق'' ہیں۔

واجد علی شاہ نے ۹ر مثنویاں لکھیں جن کے نام'' فسانۂ عشق، بحرِ الفت، مثنوی گنّا، دریائے تعشق، عشق نامہ، حزن اختر، خطابات محلات، بیتِ حیدری اور ثبات القلوب'' ہیں۔یہ مثنویاں کوئی خاص ادبی کارنامہ نہیں کہی جاسکتیں۔ان میں عشقیہ جذبات کے ساتھ ساتھ اس دَور کے زیورات، ملبوسات، محلاتِ زندگی اور درباری آداب وطور طریقے محفوظ ہوگئے ہیں۔تسلیمؔ کی اب تک گیارہ مثنویاں دریافت ہوئی ہیں۔''شامِ غریباں اور صبح خنداں'' کا شمار ان کی بہترین مثنویوں میں ہوتا ہے۔امیرؔ مینائی کی ۶ر مثنویاں پائی جاتی ہیں۔''کارنامہ عشرت'' ان کی اہم مثنوی ہے۔داغؔ نے بھی ایک مثنوی ''فریادِ داغ'' کے نام سے تحریر کی جس میں انہوں نے اپنے عشق کی داستان بیان کی ہے۔

01.07 مثنوی (دَورِ جدید میں)

اب مثنوی جدید دور میں داخل ہوتی ہے۔شاعری کی دوسری اصناف کی طرح مثنوی بھی جدید رنگ اختیار کر لیتی ہے۔اس ضمن میں آزادؔ، حالیؔ، شبلیؔ، شادؔ عظیم آبادی، نظمؔ طباطبائی، صفیؔ، صفیؔ، اقبالؔ، سردار جعفری، کیفیؔ اعظمی اور جاں نثار اختر وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ان شعرا نے مثنوی کے موضوع میں بدلاؤ اور تنوع پیدا کیا اور اس کے جدید تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے جدید طرز اظہار سے ان کی تخلیق کی۔آزادؔ اور حالیؔ نے مل کر انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی۔

اس انجمن کے تحت ہونے والے مشاعروں میں موضوعاتی نظموں کے ساتھ ساتھ موضوعاتی مثنویاں بھی پڑھی جاتی تھیں۔لہٰذا آزاد نے اس ضمن میں کئی مثنویاں تحریر کیں جو ان کے شعری مجموعہ ''نظم آزاد'' میں موجود ہیں۔ان کی مثنویاں ''شب قدر، ابوالعزیٰ، حبِ وطن، دادِ انصاف، ابرِ کرم، صبحِ امید، خوابِ امن، نوطرز مرصع'' جہاں تعریف کی مستحق ٹھہرتی ہے وہیں ان میں کئی خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔آزادؔ کی مثنویوں میں موضوعات کی وسعت اور تنوع کا احساس ہوتا ہے۔یہ مثنویاں سادہ، عام فہم اور پُر اثر انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔آزاد کی مثنوی کے موضوعات فطرت نگاری، معاشرتی اصلاح، اخلاق کی درستی، جذبۂ حب الوطنی اور قومی فلاح و بہبود وغیرہ ہیں۔حالیؔ نے بھی کم وبیش انہیں موضوعات پر مثنویاں تحریر کیں۔حالیؔ شاعری کو اصلاح وتعمیر کا وسیلہ اور خیالات کی تبدیلی کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے۔ان کی مثنویاں ان کے اِس نظریے کی نمائندہ ہیں۔

جدید مثنوی نگاروں میں حالؔی کا مقام بہت اہم ہے۔ان کے یہاں جذبہ اور فکر دونوں کا حسین امتزاج ہے۔ان کی پہلی مثنوی کا نام ''جواں مردی کا کام'' ہے جوانہوں نے ۱۸۷۲ء میں تخلیق کی۔اس کے علاوہ ''برکھا رُت،نشاطِ امید،حب الوطن،مناظرۂ رحم وانصاف، مناجاتِ بیوہ،مثنوی تعصب وانصاف،مثنوی کلمۃ الحقائق اور حقوقِ اولاد'' قابلِ ذکر مثنویاں ہیں۔شبلؔی نے ۱۸۸۴ء میں ''صبحِ اُمید'' کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔جس میں اسلام کی عظمتِ رفتہ،اُمّتِ مسلمہ کا زوال،سرسید کے اصلاحی نقطۂ نظر اور ان کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

اقبالؔ نے فارسی زبان کے ساتھ اردو میں بھی کئی مثنویاں لکھی ہیں۔اقبالؔ نے اردو مثنوی کو نئی فکری جہتوں اور معنوی وسعتوں سے آشنا کر کے اسے ایک نیا مزاج، نیا ذہنی اُفق اور نئی پہنائی عطا کی۔انہوں نے مثنوی کے ذریعے اپنے فلسفیانہ افکار پیش کیے۔اقبالؔ کی مثنویاں ان کے فن کی معراج ،فکر ونظر کی وسعت، جذبے کی شورش وتلاطم کی مثال ہیں۔ان کی مثنویوں میں ان کے فن کی پختگی ،ایمان وایقان کی پاکیزگی ،فلسفہ کی گہرائی ،فن کی لطافت ونزاکت اور عظمت ورفعت ،خیال کی ندرت اور جدت ،احساس کی ذکاوت ،زبان کی شیرینی صاف نظر آتی ہے۔''ساقی نامہ،والدہ مرحومہ کی یاد میں،انسان اور بزمِ قدرت،رخصت اے بزم جہاں اور گورستانِ شاہی'' وغیرہ ان کی مثنوی فارم میں لکھی اہم تخلیقات ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے نمائندہ وکارگزار علی سردار جعفری نے بھی ''جمہور نامہ'' کے نام سے یہ مثنوی سامراجی ظلم وستم اور مزدور ومحنت کش طبقہ کی حمایت میں لکھی ہے۔گویا یہ مثنوی موضوعی اعتبار سے سیاسی اور سماجی ہے۔اس میں رومانیت،حقیقت اور انقلاب کا امتزاج صاف طور پر دکھائی دیتا ہے۔کیفؔی اعظمی کا تعلق بھی سرسید تحریک سے تھا۔انہوں نے ۱۹۴۶ء میں ''خانہ جنگی'' کے عنوان سے ایک مثنوی تحریر کی۔جس کا موضوع فرقہ وارانہ فسادات ہے۔اس میں ہندو مسلمانوں کے باہمی افتراق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں کھلی حقیقت کو نہایت بے باکی سے نظم کیا گیا ہے۔کیفؔی نے اس مثنوی میں انسانی سوز واقعات اور خوں ریزی پر افسوس کیا ہے۔

جاں نثار اخترؔ نے ''امن نامہ'' کے نام سے ۱۹۵۲ء میں ایک مثنوی تحریر کی۔اس کا موضوع عالمی امن ہے۔جنگ اور اس کی تباہ کاری کے ہولناک منظر بیان کرتے ہوئے اخترؔ امن وامان قائم رکھنے کے قائل ہیں۔اس میں وطن پرستی اور اس سے والہانہ محبت کا اظہار بھی ملتا ہے۔اس مثنوی میں ترقی پسند عناصر واضح نظر آتے ہیں۔اپنے موضوع اور حقیقت نگاری کے اعتبار سے یہ مثنوی اہم مانی جاتی ہے۔مثنوی کا یہ سفر آج بھی جاری وساری ہے۔

01.08 خلاصہ

مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے جو لفظ مثنیٰ سے مشتق ہے۔مثنوی ایسی صنف سخن ہے جس کے شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر میں قافیہ بدل جاتا ہے مگر پوری نظم ایک ہی بحر میں ہوتی ہے۔موضوعاتی اعتبار سے مثنوی کو مختلف خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔جیسے مذہبی،تاریخی،معاشرتی،حب الوطنی اور ہندوستانی کہانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں۔مثنوی کے کچھ اجزائے ترکیبی بھی ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر مثنوی لکھی جاتی ہے۔اس میں توحید،مدحِ حاکم،تعریف شعر وسخن،سبب تالیف اور اصل قصہ اہم ہوتے ہیں۔رباعی کی طرح مثنوی بھی ایرانیوں کی ایجاد ہے۔یہ فارسی سے اردو میں آئی۔رودکیؔ،فردوسیؔ،رومیؔ،نظامیؔ گنجوی اور امیر خسروؔ فارسی کے مشہور مثنوی نگار ہیں۔

اردو میں مثنوی کی اِبتدا دکن سے ہوتی ہے۔ دکن کا پہلا مثنوی نگار بیدرؔی ہے۔ اس نے کدم راؤ پدم راؤ کے نام سے مثنوی تحریر کی۔ بہمنی دور کے دوسرے مثنوی گو شعرا میں اشرف بیابانی، میراں جی شمس العشاق ہیں۔ جن کی مثنویوں کا موضوع مذہب اور تصوف ہے۔ بہمنی سلطنت تقسیم ہو جانے سے بیجاپور اور گول کنڈہ میں عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنت قائم ہوئیں۔ جہاں اردو کی بہترین مثنویاں لکھی گئیں۔ بیجاپور کے مثنوی نگاروں میں خصوصاً برہان الدین جانم، عبدل، شاہ ابوالحسن قادری، مقیمی، رستمی، حسن شوقی اور نصرتی وغیرہ مشہور شاعر ہیں۔ جانؔم نے ''ارشادنامہ، وصیّت الہادی، حجت البقا، منفعت الایمان'' کے نام سے مثنویاں تحریر کیں۔

عبدلؔ نے ''ابراہیم نامہ'' لکھی جو عادل شاہی دور کی پہلی ادبی مثنوی مانی جاتی ہے۔ ابوالحسن قادری کی ''سکھ انجن'' اپنے رمزیاتی اور ایمائی اسلوب کی وجہ سے اہمیت رکھتی ہے۔ ''چندر بدن ومہیار'' مقیمؔی کی مثنوی ہے یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس کو مقیمی نے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک دل چسپی قائم رہتی ہے۔ رستؔمی نے ''خاور نامہ اور شوقؔی نے ''فتح نامہ نظام شاہ اور میزبانی نامہ'' مثنویاں تخلیق کیں۔ نصرتؔی اس دور کا بڑا شاعر ہے جس کو ملک الشعرا کا خطاب عطا ہوا۔ اس نے تین مثنویاں تحریر کیں ''گلشن عشق، علی نامہ اور تاریخ اسکندری''۔ بیجاپور میں اس کے علاوہ محمد عاجز، ملک خوشنود، صنعتی، ہاشمی اور امین الدین اعلیٰ نے مثنوی نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

گول کنڈہ میں احمد گجراتی، وجہؔی، غواصی، ابن نشاطی، طبعی وغیرہ مشہور مثنوی نگار گزرے ہیں۔ شمالی ہند کی پہلی مثنوی افضل کی ''بکٹ کہانی'' ہے۔ اس کے بعد شیخ عبداللہ، شیخ جیون، جعفر زٹلی، فائز دہلوی، جوہری، آبرؔو، حاتؔم اور آرزؔو وغیرہ نے مثنوی کی روایت کو آگے بڑھایا۔ میرؔ وسوداؔ نے بھی کئی مثنویاں لکھیں۔ اس کے علاوہ میر سوزؔ، میر اثرؔ، مومنؔ، میر حسن، مرزا شوقؔ، جرأتؔ، انشاؔ، رنگینؔ اور نسیمؔ نے بھی مثنوی کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا۔ اس دور میں میر حسن نے ''سحر البیان'' اور دیا شنکر نسیمؔ نے ''گلزارِ نسیم'' جیسی لافانی اور سب سے اعلیٰ اور بلند و بالا پایہ کی مثنویاں تحریر کیں۔ دورِ جدید میں حالؔی، آزادؔ، شبلؔی، شادؔ، اقبالؔ، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر نے بہترین مثنویاں تخلیق کی ہیں، جن کے موضوعات سماجی، اخلاقی اور تہذیبی رہے ہیں۔ ان میں عصرِ حاضر کے مسائل کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

01.09 فرہنگ

ابتذال : اخلاقی پستی، ذلیل حرکات

ابیات : بیت کی جمع، اشعار

اسرار : سر کی جمع

افتراق : پھوٹ

پند و موعظت : نصیحت، سمجھانا

پیل : ہاتھی

تنوع : قسم قسم کا، طرح طرح کا، الگ الگ

ثقیل : بھاری، بھدے

جسارت : ہمت، حوصلہ

جہت : سمت

حشو و زوائد : کلام میں مستعمل غیر ضروری الفاظ

دست یاب : حاصل ہونا

رموز : رمز کی جمع، اشارہ

زرگر : سُنار

لہو و لعب : کھیل کود، عیش و عیاشی

مخزونہ : دفینہ، خزانہ

مہم : لڑائی

ہیئت : شکل و صورت

01.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ مثنوی کی تعریف لکھیے؟

سوال نمبر۲ مثنوی کے اجزائے ترکیبی کون کون سے ہیں؟

سوال نمبر۳ عادل شاہی دور کے اہم مثنوی نگار اور ان کی مثنویوں کے نام تحریر کیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ قطب شاہی دَور کی مثنوی نگاری کا جائزہ لیجیے؟

سوال نمبر۲ شمالی ہند کی مثنوی نگاری پر ایک تنقیدی مضمون لکھیے؟

سوال نمبر۳ مثنوی کی تعریف کرتے ہوئے اس کی اقسام تحریر کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : ''مثنوی'' کیسی صنف ہے؟

(الف) نثری (ب) شعری (ج) دونوں (د) کوئی نہیں

سوال نمبر۲ : ''مثنوی'' کس زبان کا لفظ ہے؟

(الف) اُردو (ب) عربی (ج) فارسی (د) ہندی

سوال نمبر۳ : ''مثنوی'' کس لفظ سے بنا ہے؟

(الف) ثنا (ب) ثانیہ (ج) مثنیٰ (د) مثانی

سوال نمبر۴ : ''مثنیٰ'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) چار (ب) ایک (ج) تین (د) دو

سوال نمبر۵ : ''علی نامہ'' کس شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) نصرتیؔ (ب) وجہیؔ (ج) غواصیؔ (د) ہاشمیؔ

سوال نمبر۶ : دکن کا پہلا مثنوی نگار کون ہے؟

(الف) نصرتیؔ (ب) غواصیؔ (ج) ہاشمیؔ (د) فخرالدین نظامیؔ

سوال نمبر۷ : ''ابراہیم نامہ'' کس شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) مقیمیؔ (ب) ہاشمیؔ (ج) عبدلؔ دہلوی (د) وجہیؔ

سوال نمبر۸ : ''اَثرات'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) اَثر (ب) مؤثر (ج) بےاَثر (د) بااَثر

سوال نمبر۹ : ''فن'' کی جمع کیا ہے؟

(الف) کفن (ب) دفن (ج) فنون (د) مدفن

سوال نمبر۱۰ : ''عروج'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) رفعت (ب) بلندی (ج) عرض (د) زوال

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ب) شعری	جواب نمبر۶	: (د) فخرالدین نظامی
جواب نمبر۲	: (ب) عربی	جواب نمبر۷	: (ج) عبدل دہلوی
جواب نمبر۳	: (ج) مثنیٰ	جواب نمبر۸	: (الف) اثر
جواب نمبر۴	: (د) دو	جواب نمبر۹	: (ج) فنون
جواب نمبر۵	: (الف) نصرتی	جواب نمبر۱۰	: (د) زوال

01.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو مثنوی کا ارتقا از عبدالقادر سروری

۲۔ اردو مثنوی کا ارتقا شمالی ہند میں از گیان چند جین

۳۔ تاریخ ادب اردو (جلد اول) از وہاب اشرفی

۴۔ اردو کی منظوم داستانیں از فرمان فتح پوری

اکائی 02 مثنوی کا فن

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد

02.02 : تمہید

02.03 : مثنوی کی تعریف

02.04 : مثنوی کی اقسام

02.05 : مثنوی کے اوزان

02.06 : مثنوی کا فن

02.07 : مثنوی کی اہمیت

02.08 : خلاصہ

02.09 : فرہنگ

02.10 : سوالات

02.11 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں طلبا کے لئے مثنوی سے متعلق معلومات فراہم کی جائے گی۔اس کے ساتھ ساتھ مختصراً اس کے ابتدائی خدوخال کے بارے میں آگاہ کیا جائے گا۔اس کے علاوہ کچھ مثنویوں کے تعلق سے تبصرہ کیا جائے گا۔خصوصاً اس سبق میں مثنوی کی تعریف،اقسام،اوزان، فن اور اس کی اہمیت کا جائزہ لیا جائے گا۔

02.02 تمہید

مثنوی اردو کی شعری اصناف میں سے ایک ہے۔یہ ایک خارجی اور بیانیہ شاعری کی نمائندگی کرنے والی شعری صنف ہے۔کیوں کہ مثنوی کے موضوعات میں بڑا تنوع اور رنگارنگی ہے۔ان میں اخلاق وتصوف، پندونصائح، تہذیب وفلسفہ، مذہبی تعلیم، حسن وعشق کی داستان، رزم وبزم کی ہنگامہ آرائیاں، زمانے کی نیرنگیاں، زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی، فکرانگیز مضامین، مقاصدِ زندگی وغیرہ وغیرہ ہیں۔چنانچہ خواجہ الطاف حسین حالؔی نے مثنوی کے متعلق یہ تحریر کیا ہے۔

''مثنوی سب سے زیادہ مفید وکارآمد صنف ہے۔''

اسی طرح علامہ شبلی نعمانی اسی صنف سخن کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔''

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس صنف میں ہر طرح کے مضامین پیش کیے جاسکتے ہیں۔شاعری کی دوسری اصناف پر اس کو اپنی خوبیوں کی بنا پر برتری اور فوقیت حاصل ہے۔اور اسی وجہ سے غیر معمولی طور پر شہرت بھی اس کے نصیب میں آئی۔ یہ ایرانیوں کی اختراع ہے۔عربی میں یہ صنف نہیں پائی جاتی اور یہ فارسی شعرا کی ایجاد ہے۔اردو کے قدیم دکنی شعرا نے فارسی سے خوشہ چینی کر کے دکنی میں اس داغ بیل ڈالی۔مثنوی میں اشعار کی تعداد متعین نہیں ہے۔ یہ چند اشعار پر بھی ہوسکتی ہے اور ہزاروں اشعار پر بھی۔البتہ یہ ضروری ہے کہ اس کے تمام اشعار آپس میں جڑے ہوئے ہوں۔

02.03 مثنوی کی تعریف

مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے جو کہ لفظ مثنی سے نکلا ہوا ہے اور جس کے لغوی معنی ''دو دو'' کے ہیں یعنی اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اور ہر شعر کا قافیہ دوسرے اشعار کے قافیہ سے الگ ہوتا ہے۔مثنوی کے تمام اشعار ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔اور ہر شعر کا قافیہ دیگر اشعار کے قافیہ سے مختلف ہوتا ہے اسی بنا پر اسے مثنوی کا نام دیا گیا۔

اصطلاح میں ہیئت کے لحاظ سے مثنوی ایسی صنف سخن اور مسلسل نظم کو کہتے ہیں کہ جس میں اشعار کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں اور ہر دوسرے شعر میں قافیہ بدل جائے لیکن پوری نظم ایک ہی بحر میں ہو۔ڈاکٹر گیان چند جین کے مثنوی کے متعلق لکھتے ہیں:

''مثنوی نظم کا وہ پیکر ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں لیکن ہر شعر کے بعد قافیہ بدل جاتا ہے۔دو دو ہم قافیہ مصرعوں کی رعایت سے اس کا نام مثنوی طے پایا۔بنیادی طور پر مثنوی ایک ہیئت کا نام تھا لیکن روایت نے اس کے ہیولیٰ کا تعین کر دیا۔''

مثنوی کی ہیئت کو سمجھنے کے لئے دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم'' کے چند اشعار دیکھیے:

پورب میں ایک تھا شہنشاہ سلطان زین الملوک، ذی جاہ
لشکر کش و تاج دار تھا وہ دشمن کش و شہریار تھا وہ
خالق نے دیے تھے چار فرزند دانا، عاقل، ذکی، خرد مند
اُمید کے نخل نے دیا بار خورشید حمل ہوا نمودار

پہلے شعر میں قافیہ میں: شہنشاہ اور ذی جاہ دوسرے شعر میں: تاج دار اور شہریار

تیسرے شعر میں : فرزند اور خرد مند چوتھے شعر میں : بار اور نمودار، ..... ہیں۔

مذکورہ شعروں کے مطالعے سے آپ کے ذہن میں بخوبی سمجھ میں آجائے گا کہ مثنوی کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں اور ہر شعر کا قافیہ پچھلے شعر کے قافیہ سے مختلف ہے۔مثنوی میں ردیف کا بھی استعمال ہوتا ہے مگر بہت ہی کم ہوتا ہے۔دوسرے اشعار میں ردیف کا استعمال ہوا ہے یعنی ''تھا وہ'' ردیف ہے، تاج دار شہر یار قافیے ہیں۔

مثنوی کے اس نظام قافیہ سے ہٹ کر ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ مثنوی نگاروں نے درج ذیل اجزا یا ارکان کو بھی مثنوی میں شامل کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر مثنوی نگاروں نے اس کی پابندی نہیں کی ہے۔ البتہ کچھ اجزا تمام مثنویوں میں مل جاتے ہیں۔

عام طور پر مثنویاں ان اجزا پر مشتمل ہوتی ہیں:

﴿۱﴾ حمد ﴿۲﴾ نعت ﴿۳﴾ منقبت ﴿۴﴾ مناجات ﴿۵﴾ مدح بادشاہ یا امرا

﴿۶﴾ تعریف سخن یا تعریف خامہ ﴿۷﴾ سبب تالیف ﴿۸﴾ اصل قصہ ﴿۹﴾ اختتام۔

مثنوی ''سحر البیان'' کے آغاز میں سب سے پہلے ہمیں حمد کے اشعار ملتے ہیں پھر اس کے بعد نعت پاک کے اشعار نظر آتے ہیں اور اس کے بعد منقبت یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تعریف، اس کے بعد مناجات، تعریف سخن یا اپنے قلم کی تعریف کرتے ہیں پھر شاہ عالم بادشاہ غازی بہادر کی مدح، اس کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح، پھر مصنف کا عجز و انکسار اور ''عرض کرنا داستان'' کے عنوانات کے ذریعہ اشعار ترتیب دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ہی اصل قصہ کو شروع کیا گیا ہے۔ فی الوقت آپ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر شاعر مثنوی کا اصل قصہ شروع کرنے سے پہلے مختلف عنوانات کے تحت اشعار کہتا ہے اور یہ اشعار بھی مثنوی کے اجزاء میں شمار ہوتے ہیں۔ تقریباً ہر مثنوی میں کم و بیش یہ اجزا پائے جاتے ہیں۔ تعداد کے اعتبار سے اشعار کی تعداد مثنوی میں متعین نہیں ہوتی۔ چوں کہ غزل اور قصیدہ کی طرح اس میں ایک ہی قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ اکثر شعرا نے بڑی ہی طویل مثنویاں تحریر کی ہیں۔ عادل شاہی عہد کے شاعر ملک خوشنود کی مثنوی ''جنت سنگار'' میں تیس ہزار دو سو پچیس اشعار موجود ہیں۔ اسی طرح عادل شاہ ثانی شاہی عہد کے باکمال شاعر ہاشمی کی مثنوی ''یوسف و زلیخا'' میں پانچ ہزار ایک سو بیالیس اشعار مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مثنوی کے اشعار میں کمی و بیشی کوئی قید متعین نہیں ہے۔ مثنوی کتنے ہی اشعار پر مشتمل ہو سکتی ہے۔

02.04 مثنوی کی اقسام

مثنوی کا میدان دیگر اصناف سخن کے مقابلہ میں بڑا ہی وسیع و کشادہ ہے۔ اس میں اخلاقی قصے، مذہبی مضامین، تصوف کے مسائل کی باریکیاں، سیاسی حالات، تاریخی واقعات، دنیا کی بے ثباتی، رزم و بزم کی معرکہ آرائیاں، اساطیری اور دیومالائی حکایات، جنگی مہمات، میدانِ کارزار کے مناظر، سچ اور جھوٹ کی ہنگامہ آرائی، مذہبی تعلیم، حسن و عشق کی داستان، زمانہ کی نیرنگی، زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی، فکر انگیز مضامین، سماجی زندگی کا تانا بانا، مظاہرِ قدرت کی دل کشی، آپ و جگ بیتیاں، قرآنی قصے وغیرہ پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے موضوعات و عناوین کا دائرہ حقیقتاً بہت ہی وسیع ہے اور اس کے اندر عنوانات و مضامین کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی ہے۔

اسی کے تعلق سے ذیل میں کچھ مشہور و معروف شخصیات کے مضمون اور مقالوں کے اقتباس پیش کیے جاتے ہیں:

ڈاکٹر سید عبداللہ نے مثنوی سے متعلق اپنے ایک مضمون ''اردو مثنوی کا دکنی دور'' میں دکنی مثنویوں کو چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

﴿۱﴾ رزم نامے ﴿۲﴾ عشقیہ داستانے ﴿۳﴾ سچی کہانیاں

﴿۴﴾ عشقیہ آپ بیتیاں ﴿۵﴾ اخلاقی اور فلسفیانہ مثنویاں ﴿۴﴾ صوفیانہ تمثیلی مثنویاں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنا مشہور مقالہ ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں''
میں مقامی موضوعات پر مشتمل مثنویوں کو چھ حصوں میں اس طرح تقسیم کیا ہے:

﴿۱﴾ مذہبی مثنویاں : مثلاً: رامائن از.....جگن ناتھ خوشتر

﴿۲﴾ تاریخی مثنویاں : مثلاً: علی نامہ از.....نصرتی

﴿۳﴾ وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کے معاشرتی کوائف و آثار کی تفصیل ملتی ہے۔
مثلاً: شاہ حاتم، میر، راغب، فائز، قائم چاندپوری اور شیر علی افسوس کی مثنویاں ہولی کی تعریف میں ہیں۔

﴿۴﴾ وہ مثنویاں جو ہندوستان کے فطری مظاہر یا موسموں کے بارے میں ہیں۔
مثلاً: سوداؔ کی مثنوی گرمی کے بیان میں یا میر کی مثنوی در مذمت برشگال۔

﴿۵﴾ وہ مثنویاں جن میں حب الوطنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔
مثلاً: حضرت شاہ مراد کی مثنوی در بیان لاہور یا ولی کی مثنوی شہر سورت کی تعریف میں۔

﴿۶﴾ ہندوستانی قصے کہانیوں سے ماخوذ مثنویاں۔

اردو مثنوی کے موضوعات بہت ہی متنوع ہیں۔ بہت سی مثنویاں ایسی بھی ہے جنہیں کسی ایک موضوع کے تحت رکھنا بھی مناسب نہیں ہے۔ ان میں بیک وقت ایک سے زیادہ نوع کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اس لئے موضوع کی مناسبت سے مثنوی کی حد بندی کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہیں۔ اسی کی مناسبت سے امداد امام اثر کا ایک قول پیش کیا جاتا ہے۔

''مضامین کے اعتبار سے جو وسعت اس صنف شاعری کو حاصل ہے کسی اور صنف کو نہیں ہے۔ ہر طرح کے داخلی اور خارجی مضامین اس میں گنجائش پاتے ہیں۔''

امداد امام اثر نے مثنویوں کو موضوع کے اعتبار سے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جو کہ ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

﴿۱﴾ رزمی مضامین ﴿۲﴾ بزمی مضامین ﴿۳﴾ حکمت آموز مضامین

﴿۴﴾ تصوف آمیز مضامین ﴿۵﴾ متفرق مضامین۔

متفرق مضامین کے تحت بہت سی مثنویوں کا احاطہ ہوجاتا ہے۔ کوئی شعبہ فکر و عمل ایسا نہیں ہے جس پر اردو میں مثنویاں نہ لکھی گئی ہوں۔ عشق و مذہب سے لے کر ملّی، قومی اور سماجی مسائل تک لامحدود موضوعات مثنویاں کہی گئی ہیں۔ پھر مثنوی کا اصل مزاج داستان عشق کا بیان ہے اور اس کا خاص وصف واقعہ نگاری ہے۔ ہیئت پر زور دینے سے مثنوی میں بسا اوقات دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ نظم اور مثنوی امتیاز کرنا مشکل پڑ جاتا ہے۔

اسی سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اردو شاعری کا مزاج'' میں ایک اہم اور خاص نکتے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے آپ لکھتے ہیں:

''مثنوی کا لغوی مفہوم دوہرا کرنے کا ہے اور اس سے مراد وہ صنف ہے جس میں ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم وزن ہوں۔ اردو شعرا نے مزاج کے بجائے ہیئت کو تمام تر اہمیت بخشتے ہوئے مثنوی کو کسی خاص

موضوع تک محدود نہیں رکھا اور یوں عشقیہ داستان کے علاوہ شکار، سیر و سیاحت اور دوسرے موضوعات کو بھی مثنوی کے دامن میں سمیٹ لیا ہے۔ اصولاً یہ بات غلط ہے کہ کسی صنف کو محض ہیئت کی بنا پر ایک الگ صنف کا درجہ دیا جائے کیوں کہ کسی صنف کے وجود کا جواز محض اس بات میں ہے کہ وہ انسانی شخصیت کے کسی خاص پہلو کو دوسری اصناف کی بہ نسبت بہتر طریقہ سے سامنے لاسکتی ہے۔ مثنوی کا اصل مقصد محبت کی داستان کو بیان کرنا ہے۔ اگر مثنوی کو مختلف اور متنوع خارجی موضوعات کے لئے برتا جائے یا عشقیہ داستان کے بیان میں محض واقعات کے بیان کو تمام تر اہمیت تفویض کر دی جائے تو اس سے مثنوی کا اصل مزاج مجروح ہوتا ہے۔''

مذکورہ نقطۂ نظر سے آپ مثنوی کو ایک منظوم عشقیہ داستان کہہ لیجیے۔ کیوں کہ مثنوی بنیادی طور پر ایک داستان ہوتی ہے، وہ کسی نہ کسی عہد کی معاشرت سے منسلک ہوتی ہے۔ مثنوی نگار میں غیر معمولی قوت بیان کا مادہ ہونا چاہیے۔ اسی لئے وہ کہانی کو پیش کرتے ہوئے شروع سے آخر تک قارئین کی دل چسپی اور اس کا انہماک برقرار رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

02.05 مثنوی کے اوزان

مثنوی کے لئے عام طور پر سات بحریں مروّج رہی ہیں۔ اسی سے متعلق مولانا جلال الدین احمد کا یہ اقتباس بھی بہت ہی خصوصیت و اہمیت کا حامل ہے۔ جو کہ حسب ذیل ہے:

''یہ کوئی ضروری اور لازمی امر نہیں ہے کہ ان کے مستعملہ اور مروّجہ اوزان کے علاوہ کسی دوسرے وزن میں مثنوی لکھنا ناجائز سمجھا جائے۔ البتہ جن وزنوں کو مخصوص کیا گیا ہے، ان میں بہ نسبت دوسرے اوزان کے دل کشی، ترنم اور موزونیت زیادہ ہے۔''

عام طور پر جن سات بحروں میں عام طور پر مثنویاں کہی جاتی ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:

﴿۱﴾ بحر متقارب مثمن مقصور: فعولن فعولن فعولن فعول۔

یہ بحر عام طور پر رزمیہ مثنوی کے لئے مخصوص سمجھی جاتی رہی ہے۔ فردوسی کا شاہنامہ بھی اسی بحر میں ہے۔ میر حسن نے اسی بحر میں اپنی مشہور و معروف عشقیہ مثنوی ''سحر البیان'' لکھ کر اپنی سحر بیانی سے یہ ثابت کر دیا کہ اس میں بے پناہ رواں دواں اشعار کہے جاسکتے ہیں:

نہیں ایک صورت پہ کوئی مدام اُسی کی غرض ذات کو ہے قیام
کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں (سحر البیان، میر حسنؔ، ص/۵۷)

﴿۲﴾ بحر رمل مسدس محذوف: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن۔

یہ بحر عام طور پر پند و نصائح اور اخلاقی مضامین کے لئے موزوں سمجھی گئی ہے، مثلاً:

عارفوں کے رمز سے آگاہ کر ملکِ درویشی کا مجھ کو شاہ کر (رموز العارفین، میر حسنؔ، ص/۵۸)

﴿۳﴾ بحر رمل مسدس مخبون محذوف مسکن: فاعلاتن فعِلاتن فعْلن ۔

ساقیا! زہر پلا دے مجھ کو شربتِ مَرگ چکھا دے مجھ کو

تلخیِ یاسِ عبادت کب تک؟ حسرتِ ذوقِ شہادت کب تک؟ (قولِ غمین، مومنؔ، ص۳۳۲)

﴿۴﴾ بحر ہزج مسدس محذوف مفاعیلن مفاعیلن فعولن۔

مطول کر تُو میری زندگانی تُو برخوردار کر میری جوانی (پھول بن، ابنِ نشاطیؔ، ص۶)

﴿۵﴾ بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض محذوف مفعولُ مفاعلن فعولن۔

آتا ہو تو ہاتھ سے جانے نہ دیجے جاتا ہو تو اُس کا غم نہ کیجے (گلزارِ نسیم، دیا شنکر نسیمؔ)

﴿۶﴾ بحر رمل مسدس محذوف: فاعلاتن فاعلاتن فاعلن ۔

خوب جو کرتا ہے تُو آپ ہی دوا اور کوئی آپ سا مجھ کو بتا (مثنوی در ہجوِ حکیم غوث، کلیاتِ سوداؔ، جلد۳/، ص۱۴۶)

﴿۷﴾ بحر خفیف مسدس مخبوں محذوف فاعلاتن مفاعلن فعلن ۔

اے وطن! اے مرے بہشتِ بریں کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں؟

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا (حبِ وطن، حالیؔ، ص۴)

﴿نوٹ﴾ اِن سات بحروں کے علاوہ اور بھی بحروں میں مثنویاں کہی گئی ہیں مثلاً:

﴿۱﴾ بحر متقارب مثمن اَثلم فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن ۔

گُل آشفتہ اُس کے رُو کا سُنبُل اک زنجیری مُو کا

دیکھ اُس گُل کی نور اَفشانی شمعِ مجلس پانی پانی (جوشِ عشق، میرؔ، ص۹۵۳)

﴿۲﴾ بحر متقارب مثمن اثرم فَعلُ فعولن فَعلُ فعولن۔

سیرِ گلستاں خار لگے ہے موجِ رواں تلوار لگے ہے (تفِ آتشیں، مومنؔ، ص۳۶۰)

﴿۳﴾ بحر ہزج مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن۔

اُسی کے نام سے آغاز ہے اِس شاہ نامے کا ہمیشہ جس کے دَر پر سر جھکا رہتا ہے خامے کا (شاہ نامۂ اسلام، حفیظ جالندھری)

عام طور پر شعرا نے چھوٹی بحروں میں بھی ہی مثنویاں کہی ہیں۔

02.06 مثنوی کا فن

اصناف شاعری میں مثنوی بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔اس صنف کو بیانیہ شاعری کی معراج سمجھا جاتا ہے اوراس کے لئے ربط و تسلسل بہت ہی لازمی اورضروی ہے۔مثنوی میں حقیقتاً واقعات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے اسی لئے تسلسل کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔اس لئے یہ بھی ضروری سمجھا گیا کہ مثنوی کا ہر شعر دوسرے شعر سے زنجیر کی کڑیوں طرح مربوط اور جڑا ہوا ہو۔اس میں کسی طرح کا نقص یا کوئی جھول نہ ہو۔مثنوی میں پلاٹ کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ ایک واقعہ سے دوسرا واقعہ آپ سے نکلتا چلا آئے۔جن ضمنی واقعات کی وجہ سے قصہ آگے بڑھتا ہے ان میں بھی ایک منطقی ربط و تسلسل اور تناسب وتوازن ہو۔کسی بھی واقعات کو پیش کرتے ہوئے اس کی جزئیات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

ذیل میں مثنوی کے جزئیات کو پیش کرتے ہیں جو کہ مثنوی نگاروں کے لئے بہت ہی ضروری ہیں۔

﴿۱﴾ **کردار نگاری:**۔مثنوی میں قصہ افراد کی مدد سے آگے بڑھتا ہے اس لئے مثنوی میں کردار نگاری کی اہمیت پر خاص توجہ دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔قصہ کی دل چسپی میں اضافہ کرداروں کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔مثنوی میں مختلف طبقے اور عمر کے لوگ ہوتے ہیں۔یہ بادشاہ وو زیر بھی،شہزادے اور شہزادیاں بھی،وزیرزادے اوروزیرزادیاں بھی،آقا اور نوکر بھی،بچے،جوان اور بوڑھے بھی،عالم وجاہل بھی،مختلف پیشوں کے لوگ بھی۔غرض ہر ایک کی طرزِ زندگی مختلف اور گفتگو کا ڈھنگ الگ ہوتا ہے۔باکمال شاعر وہی ہے جو تمام کرداروں کو اس طرح پیش کر سکے کہ وہ خوبیوں اور خامیوں سمیت سامنے آجائیں اوران میں زندگی کی حرکت ہو وہ شاعر کے ہاتھوں کٹھ پتلی نہ بن جائیں زمانہ اور ماحول پر ان کا اثر ہو۔

﴿۲﴾ **جذبات نگاری:**۔ایک مثنوی میں مختلف کردار ہوتے ہیں ہر ایک کا رول جداگانہ ہوتا ہے۔اور ہر کردار کو اس کی فطرت کے عین مطابق ڈھالنا پڑتا ہے۔مختلف موقعوں اور حالات کے تناظر میں ہر ایک کے جذبات کی منفرد تصویر کشی کرنے پڑتی ہے۔

﴿۳﴾ **منظر نگاری:**۔مناظر کی حقیقی تصویر کشی سے قصہ کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے یہ تصویر کشی جس قدر حقیقت سے قریب ہوگی اسی قدر اثر انگیز ہوگی۔صبح کا منظر ہو یا شام کا،بہار کا موسم ہو یا خزاں کا،مناظر کو ہسار ہو یا آبشار،باغ کا منظر ہو یا کہ دربار کا ان کی فطری تصویریں پیش کی جائیں تو ان کا لطف ہی کچھ اور دوبالا ونرالا ہو جاتا ہے۔تصنع اور مبالغہ سے منظر نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا ہے۔

﴿۴﴾ **زبان وبیان:**۔طرزِ اظہار کی مثنوی میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔موضوع کے اعتبار سے زبان کا استعمال کرنا چاہیے۔ بزم کے بیانات میں جہاں شیریں لب ولہجہ ضروری ہے وہیں رزم کے بیان میں پرشکوہ الفاظ اور بلند آہنگی کا ہونا ناگزیر ہے۔پرتکلف طرز کے مقابلے میں سادہ وپرکار انداز بیان زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

02.07 مثنوی کی اہمیت

مذکورہ معلومات کے مطالعے سے اب آپ کو یہ اندازہ بخوبی ہوگیا ہوگا کہ دوسری اصناف شاعری کے مقابلے میں مثنوی کا میدان بہت ہی وسیع وعریض ہے۔علامہ شبلی نعمانی کا ایک قول یہاں بہت ہی مناسب وموزوں ہے جس کو ذیل میں پیش کیا گیا ہے:

''انواع شاعری میں یہ صنف تمام انواع کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع، زیادہ ہمہ گیر ہے۔ شاعری کے جس قدر انواع ہیں سب اس میں زیادہ خوبی سے ادا ہوسکتے ہیں۔جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری اور تخیل اور ان تمام چیزوں کے لئے مثنوی سے زیادہ بہتر کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا۔''

مثنوی کے اندر تصوف ومذہبی تعلیمات اور حسن وعشق کی داستان کو بھی پیش کیا گیا ہے۔مثنوی کے اندر غزل کی دل فریبی ہے تو قصیدہ کا شان وشکوہ بھی، گیتوں کا حسن اور نغمگی بھی، یہ خوبی کے ساتھ خارجی پہلو کو بھی بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور داخلی کیفیات وجذبات کو اُبھارنے کی بھی اہلیت رکھتی ہے۔مثنوی کے اندر خارجیت اور داخلیت کی دوئی مٹتی نظر آتی ہے۔

احسن مارہروی نے مثنوی کی افادیت واہمیت پر اپنا اظہارِ خیال اس طرح پیش کیا ہے:

''نظم کی تمام اصناف میں مثنوی ایک خاص حیثیت رکھتی ہے۔اس کی وسعت، اس کی ہمہ گیری اور اس کے فوائد سب سے زیادہ اور سب پر بھاری ہیں۔جذبات انسانی، مناظرِ قدرت، تاریخی واقعات جس خوش اسلوبی اور روانی سے مثنوی میں سما سکتے ہیں ان کی اتنی گنجائش کسی صنف سخن میں نہیں۔زندگی کے تمام سوانح، رزم ہوں یا تاریخی، عشقیہ ہوں یا اخلاقی، فلسفیانہ ہوں یا افسانہ غرض کی تخیل کی کھپت مثنوی میں ہوتی ہے۔''

مثنوی اردو شاعری کی اصناف میں اس اعتبار سے بھی جداگانہ امتیاز رکھتی ہے کہ مناظر، واقعات، کیفیات اور زندگی کے ہمہ جہت پہلوؤں کی ترجمانی مربوط ومنظم انداز کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس میں جذبات نگاری، معنی آفرینی اور منظر کشی کے بہترین نمونے قدم قدم پر ملتے ہیں۔رزم وبزم، خلوت وجلوت، اخلاقی وروحانی مسائل، عشق ومحبت، قدرتی مظاہر اور مناظر کی تصویر کشی کا حق مثنوی نگاروں نے ادا کیا ہے۔ایک اچھی مثنوی لکھنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔اس کے لئے بڑی عرق ریزی، بڑی ریاضت، ربط، خیال، احساس، تناسب، ذوق، ترتیب، تنظیم اور فنی پختگی کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی بحث سے متعلق عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

''مثنوی میں کہنے کو ایک قصہ، واقعات کا ایک گڑھا ہوا سلسلۂ خیالی اور اکثر اوقات فوق الفطرت یا خلافِ قیاس افسانہ ہوسکتا ہے لیکن واقعات کو جوڑنے اور ان کو انجام تک پہچانے یعنی ان کے اِرتقا میں حیات کے بہت سے حسین اور قبیح پہلو آجاتے ہیں۔اس ڈرامائی مواقع، بیان اور مرقع نگاری کی شاعری کی توضیحات، طربیہ شاعری کی شگفتگی، حزنیہ شاعری کی اثر اندازی، رزمیہ اور قصیدے کا طمطراق، غزل کی دل گدازی غرض سب کچھ سما سکتے ہیں۔''

﴿۱﴾ اخلاقی عناصر کی نمائندگی:۔ اخلاقی عناصر کی کارفرمائیاں بھی مثنویوں میں صاف نظر آتی ہے۔اخلاقیات کا ہماری تہذیبی زندگی میں بڑا دخل رہا ہے۔شاعروں نے اپنی مثنویوں میں مسحور کن واقعات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا بھی سبق دیا ہے۔اس کی ایک مثال میں قطب مشتری میں وجہی کہتا ہے۔مندرجہ ذیل میں قطب مشتری کے وہی اشعار درج ہیں:

انسان کو ہر حال میں اللہ رب العزت پر توکل وبھروسہ کرنا چاہیے۔

توکل خدا پر جو کرتا ہے اَہے ۔۔۔ وو ہرگز نہیں کس تے ڈرتا اَہے

حریص ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے:

جکوئی بوالہوس ہور طمع دار ہے ۔۔۔ جہاں جائے گا وو، وہاں خوار ہے

دنیا سرائے فانی ہے اس عبرت حاصل کرنا چاہیے:

کہ دائم رہنے کا نہیں ٹھار یاں ۔۔۔ نہیں کوئی آیا ہے دو بار یاں

جو شخص شریف النفس ہے وہ غرور نہیں کرتا:

جکوئی جو اصیل ہور ذاتی اَہے ۔۔۔ بڑائی نہیں اُس تے آتی اَہے

☆

ابن نشاطی پھول بن میں کہتا ہے کہ: انسان کو ہمیشہ صبر سے کام لینا چاہیے جلدی میں کوئی کام بحسن خوبی انجام کو نہیں پہنچتا:

جو کچھ ہوئے بھی ہمت کوں نہ سٹنا ۔۔۔ نہ سٹنا صبر کوں، دولت نہ سٹنا

شتابی سوں نہیں ہوتا ہے کچ کام ۔۔۔ ہر یک آہستگی میں ہے سرانجام

حرص یعنی لالچ بہت ہی بری چیز ہے:

طمع داری بُری ہے، اے عزیزاں! ۔۔۔ نہیں کچھ خوب، اے صاحب تمیزاں!

طمع داری تے آتی یار خواری ۔۔۔ طمع داری میں نیں ہے رُست گاری

چغلی کھانا بری بات ہے:

نہیں کچ خوب چاڑی کا ہے چالا ۔۔۔ ہے چاڑی خور کا مُوں جگ میں کالا

میر حسن اپنی مثنوی ''سحر البیان'' میں لکھتے ہیں:

سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں ۔۔۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں ۔۔۔ سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

غواصی اپنی مثنوی ''میناستونتی'' میں کہتا ہے:

یو دنیاں کری نیں وفائی کسے ۔۔۔ نہ بھاوے گی یو آشنائی کسے

بھلا ہے جو قائم اچھو اپنی کھاٹ ۔۔۔ سلامت اچھو گھونگڑی ہور تاٹ

حرص آدمی کا تو ناپاک ہے ۔۔۔ اصیل کوں سدا شرم کا دھاک ہے

رکھے شرم جس کا سو اُو ذوالجلال ۔۔۔ سکے ظلم کرنے کوں کس کا مجال؟

صنف مثنوی کی اہمیت وافادیت مسلّم ہے۔ یہ صنف بیانیہ اور وضاحتی شاعری کی معراج ہے۔ مثنوی کہنے کے لئے غیر معمولی فنی مہارت درکار ہے اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت کی ضرورت ہوتی ہے۔

مثنوی نگاروں نے جذبات نگاری اور منظر نگاری میں اپنے جوہر فن کا کمال دکھایا ہے۔ عصری رسم ورواج کی بہترین تصویر کھینچی ہے اور اس عہد کی تہذیبی وسماجی زندگی کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ اپنے ماحول ومعاشرہ کی متحرک اور زندہ تصاویر پیش کی ہیں۔ زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جسے مثنوی کا موضوع نہ بنایا گیا ہو اس لئے اردو مثنویوں میں بڑا تنوع ہے۔ مثنوی کی ہمہ گیری کا پتہ اسی سے چلتا ہے۔ جہاں مثنویوں میں حسن وعشق کے بہترین جذبات، اخلاق اور تصوف کے گراں قدر نکات ملتے ہیں وہیں رزمیہ شاعری، تاریخی واقعہ نگاری اور تہذیبی زندگی کے ہمہ جہت پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ مثنوی میں سماج، ماحول ومعاشرہ پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

﴿۲﴾ تہذیبی وسماجی زندگی کی عکاسی:۔ اس اعتبار سے بھی مثنوی کو بھی فوقیت حاصل ہے۔ کہ اس میں تہذیبی اور سماجی زندگی کی عکاسی کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ ہر مثنوی نگار نے اس میں زندگی کے مختلف اور متعدد پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے اپنے عہد کی روح کو اسیر کر دیا ہے۔ یہی بات ہے کہ اس میں ہماری تہذیبی اور سماجی زندگی کے لازوال مرقعے محفوظ ہیں۔ اگر چہ مثنویوں میں ایسے شہروں اور ملکوں کا بیان ہے جن کا تعلق ہندوستان سے نہیں بعض ایسے خطوں کا تذکرہ ہے جن کا دنیا میں وجود ہی نہیں ہے تاہم ان میں ہندوستان کے شہروں کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ مثنوی میں پیدائش سے لے کر موت تک بہت سی رسومات، بہت سی تقاریب، بہت سی عیدوں اور تیوہاروں کا بیان ملتا ہے۔ ان میں جا بجا ہندوستانی تہذیب وتمدن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ مثنوی جس قدر کامیابی کے ساتھ خارجی دنیا کے واقعات اور اس دور کی تہذیب ومعاشرت کے رنگ برنگے پہلوؤں کو پیش کر سکتی ہے کوئی اور صنف اتنا سب کچھ پیش نہیں کر سکتی۔ مثنوی نگار خواہ وہ کسی بادشاہ یا شہزادے کے عشق کی داستان پیش کرے یا جنوں اور پریوں کا تذکرے کرے وہ اپنی کہانی کے تار وپود تیار کرتے ہوئے اپنے عہد کی سماجی زندگی سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ عام طور پر مثنوی کا ہیرو کوئی شہزادہ اور ہیروئن کوئی شہزادی ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں درباری زندگی کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ یہاں وزیر، وزیرزادے اور وزیرزادیاں بھی ہیں مختلف علوم وفنون کے ماہر بھی رمال، نجومی اور جیوتش بھی۔ سید عبدالباری کا خیال ہے کہ:

مثنوی کو ہم درباری ادب کی ایک نمائندہ صنف کہہ سکتے ہیں اس لئے کہ اس کا سارا وجود اُمرا، بادشاہوں، وزیروں اور شاہزادوں کے گرد رقص کرتا نظر آتا ہے اور اس کے کردار عام طور پر مثالی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے ہندو معاشرہ میں یہی طبقہ مرکزی اہمیت کا حامل تھا، تہذیب وتمدن کے جملہ مظاہر اس کے مرہون منت تھے۔ عوام الناس کی نگاہیں اس پر ہمیشہ اور ہر معاملہ میں اُٹھتی تھیں۔ چنانچہ اس عہد کی قصہ کہانیاں بھی اسی پر مرکوز ہوتی تھیں جس دور میں یہ مثنویاں لکھی گئی ہیں اس دور میں لوگ علم نجوم پر بھروسہ کرتے تھے۔ جوتش، رمّال، نجومی وغیرہ مستقبل کے بارے میں حکم لگاتے تھے۔ نجوم سے دل چسپی معاشرت کا ایک خاص جزو تھا اس میں عوام وخواص کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ جن بھوت، دیو، پری وغیرہ پر لوگوں کا اعتقاد تھا۔ لوگ بڑے ضعیف الاعتقاد تھے۔ توہم پرستی کا یہ رجحان کسی ایک طبقہ یا گروہ تک محدود نہیں تھا۔

آپ قطب مشتری یا سحر البیان اور گلزار نسیم کا مطالعہ کیجیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس دَور میں علمِ نجوم اور نجومیوں کا زندگی کے معاملات میں بڑا دخل تھا۔ زائچہ بنانے کا رواج عام تھا۔ ولادت کے وقت ہر بچہ کا زائچہ تیار کیا جاتا تھا۔ سب نوزائیدہ کے مستقبل کے تعلق سے جاننے کے لئے بے چین و بے قرار رہتے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ کی ولادت فال دیکھی جاتی ہے۔

ابراہیم قلی قطب شاہ جب قلی قطب شاہ کو تاج وتخت سونپتا ہے اس وقت بھی فال دیکھی جاتی ہے۔ جب قلی قطب شاہ مریخ خاں کو بنگالہ کی بادشاہی سونپتا ہے اس وقت بھی فال دیکھی جاتی ہے۔ گلزار نسیم میں تاج الملوک کی پیدائش پر بھی فال دیکھی جاتی ہے۔

سحر البیان میں بادشاہ کی نامرادی کو دور کرنے کے لئے اہل دربار یہ مشورہ دیتے ہیں کہ اس سلسلے میں نجومیوں کی رائے لی جائے۔ صرف یہی نہیں رمال اور برہمن بھی طلب کیے جاتے ہیں اور ہر ایک اپنے علم کی مدد سے امید کا پیغام دیتے ہیں۔

اسی سے متعلق چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

قطب مشتری کے یہ اشعار دیکھیے:

سنوار یا بھوت چھب سوں شہ سب شہر — نجومیاں کوں ساعت سعد پوچھ کر

گلزارِ نسیم کے یہ اشعار دیکھیے:

خوش ہوتے ہی طفلِ مہ جبیں سے — ثابت یہ ہوا ستارہ بیں سے
پیارا یہ وہ ہے کہ دیکھ اِسی کو — پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

سحر البیان کے یہ اشعار دیکھیے:

نجومی و رَمال اور برہمن — غرض یاد تھا جن کو اِس ڈھب کا فن
بلا کر اُنہیں شہ کنے لے گئے — جوں ہی روبرو شہ کے سب وے گئے

بادشاہ ان سے پوچھتا ہے:

نصیبوں میں دیکھو تو میرے کہیں — کسی سے بھی اولاد ہے یا نہیں؟
یہ سن کر وہ رمّالِ طالع شناس — لگے کھینچنے زائچے بے قیاس
دَھرے تختے آگے، لیا قرعہ ہاتھ — لگا دھیان اولاد کا اُس کے ہاتھ
جو پھینکیں تو شکلیں کئی بیٹھیں مِل — کئی شکل سے دل گیا اُن کا کِھل
جماعت نے رمّال کی عرض کی — کہ ہے گھر میں اُمید کی کچھ خوشی

بہت سی مثنویوں میں جشن ولادت، سال گرہ، شہزادوں کی بسم اللہ کی تقریب کا ذکر ملتا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ شہزادوں کو کن کن علوم کی تعلیم دی گئی اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس دور میں لوگوں کی کن کن علوم سے بہت زیادہ دل چسپی تھی۔ ولادت کے موقع پر رقص وسرود کی محفلوں کا انتظام ہوتا تھا، دعوت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ لوگ اپنے مرتبہ کے مطابق خلعت، انعام واکرام اور جاگیروں سے نوازے جاتے تھے۔ جشن طرب کے موقعوں پر محلات کو مشک، زعفران اور عبیر وغیرہ سے معطر کیا جاتا تھا اور راستوں پر زربفت، کمخواب اور اطلس

بچھائے جاتے تھے۔قطب مشتری میں محمد قلی قطب شاہ اور سحرالبیان میں بے نظیر کی پیدائش کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ پیدائش کے جشن کے موقع پر کس طرح شان وشوکت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ملا وجہی اور میر حسن نے جو بھی لکھا ہے اس سے اس عہد کی معاشرت کا بہتر طور پر اندازہ ہوجاتا ہے۔

میر حسن نے بے نظیر کی پیدائش کے جشن کی بڑی عمدہ تصویر پیش کی ہے۔قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اس شاہی دور کے واقعات اپنی آنکھوں کے پردۂ سیمیں پر منعکس ہوتے دیکھ رہا ہے۔مختلف ساز اور سازندوں ،مختلف فرقوں اور خدمت گزاروں کا جو ذکر کیا ہے اس سے ان کی خدمات ،امتیازات اور درباری زندگی کی نمایاں سامنے آجاتی ہے۔کئی مثنویوں میں شادی کی مختلف رسوم کو بڑی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ دولھا دلہن کی آرائش ،محفل نکاح اور مختلف رسوم کو بہت ہی اچھے اور منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

حسن شوقی نے میزبانی نامہ میں جو نواب مظفر خاں کی لڑکی اور محمد عادل شاہ کے جشن عقد کی دھوم دھام اور رنگارنگی کو خوب صورت انداز میں نظم کر دیا ہے۔شادی کے موقع پر محلات کی سجاوٹ،رقص ، بادشاہ کی سواری اور ضیافت کا ذکر اس عمدگی سے کیا ہے کہ اس دور کی طرزِ معاشرت اور رسم ورواج کی منفرد اور نمایاں تصویریں ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ہاشمی کی یوسف وزلیخا،نصرتی کی گلشن عشق اور میر حسن کی سحرالبیان میں بزم عقد کا نقشہ منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ان میں ایسی رسومات کا بھی ذکر ملتا ہے جو آج بھی جاری ہے۔اگر چہ یوسف اور زلیخا ایک مذہبی قصہ ہے لیکن ہاشمی نے اسے دکنی مزاج کے مطابق ڈھال دیا ہے۔ہاشمی نے مانجھے کی بارات اور تیاری کا منظر نیز جمعگی اور انگوٹھیاں کھلوانے کی رسم کا بیان بڑی اچھے اور بہتر طریقے سے پیش کیا ہے۔

نصرتی نے گلشن عشق میں تعریف آرائش محفل کے عنوان سے جو شعر کہے ہیں اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر محلات کو کس طرح سنوارا جاتا تھا۔آرائش وزیبائش کے لئے کیا کیا چیزیں استعمال کی جاتی تھیں۔محلات کو کس طرح منقش کیا جاتا تھا۔شادی کے موقع پر عالی شان منڈھوے تانے جاتے تھے،قیمتی قالین بچھائے جاتے تھے،نفیس تکیے بھی رکھے جاتے تھے۔آسماں گیریاں بھی لگائی جاتی تھیں۔نصرتی نے ضیافت کے بیان میں مختلف کھانوں اور ترکاریوں کا ذکر بھی کیا ہے۔اس نے جن پکوانوں کا ذکر کیا ہے وہ آج بھی دکن میں پکائے جاتے ہیں۔نصرتی نے میٹھی چیزوں میں مزعفر،کاک،شکر پارہ،سوئیاں،جلیبی،فالودہ، بتاشے،فرنی، ریوڑیاں،سوجی کا حلوہ،لڈو،اور کھانوں میں بریانی،قبولی، پلاؤ،خشکا اور کھچڑی کا تذکرہ کیا ہے۔ترکاریوں میں کدو،بیگن، چچینڈا،سیم،سبزیوں میں پالک،میتھی،سویا وغیرہ کا استعمال ہوتا تھا۔رسوم میں ہلدی کی رسم،انگوٹھیاں کھلوانے کی رسم،مانجھے اور جلوہ کی رسم کا بیان کیا گیا ہے۔

میر حسن نے سحرالبیان میں شہزادے بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے عقد کا منظر بڑی ہی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔شادی کی تمام رسومات کا ذکر کیا ہے۔کئی مثنویوں میں ملبوسات اور زیورات کی تفصیل بھی ملتی ہے۔

مثنوی سحرالبیان کے چند ایسے اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں زیورات کی تفصیل بھی موجود ہے:

وہ ترکیب اور چاند سا وہ بدن　　وہ بازو پہ ڈھلکے ہوئے نو رتن
جڑاؤ وہ بالے کہ بالے کا رشک　　وہ موتی کے مالے کہ عاشق کا اشک
وہ آنکھوں کی مستی، وہ مژگاں کی نوک　　کرن پھول کی اور بالے کی جھوک

وہ موتی کا دُلڑا، وہ موتی کا ہار — سدا اشکِ غم دیدہ جس پر نثار
لگا دُھدھکی پچ لڑا، ست لڑا — سراسر گلے حُسن اُس کے پڑا
جڑاؤ دمکتی وہ چنپا کلی — رہے جس سے الماس کو بے کلی

عبدل نے ابراہیم نامہ میں زیورات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

کوئی رکھ جڑت سیس پھول سیس بال — رہیا جیوں مشک راس پر آئے لال
کوئی جڑت ٹیلا پیشانی میں لائے — کھڑا سورج جیوں صبح میدان آئے
کوئی کان کھونٹیاں جڑت پینہ آئے — بیٹھا چاند دوسُرج کے چاک لائے
کوئی کالے لٹکن سو پھندے دَھرے — کنول پھول پر آ بھنور جیوں تھرے مثنوی ابراہیم نامہ،عبدل دہلوی،

ص/۵ ۷،۴ ۷،۳ ۷،۲ ۷،۱

اگر چہ مثنویوں میں دور دراز ممالک کا ذکر ہے لیکن اس میں جو ماحول پیش کیا گیا ہے وہ ہندوستانی ہے۔ان مثنویوں میں ہندوستانی معاشرت کا عکس ہے۔ان میں یہاں کا رہن سہن، یہاں کے محلات،عمارتیں،ضیافتیں،ملبوسات اور زیورات کا ذکر موجود ہے۔ان میں مقامی رنگ وآہنگ موجود ہے۔

﴿۳﴾ **مثنوی میں تنقیدی خیالات**:۔تعریفِ سخن یا تعریفِ خامہ کے عنوان سے موسوم ہونے والے اشعار جو کہ مثنوی نگاروں نے لکھے ہیں اس سے ان کی تنقیدی نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔انہیں فنی اقدار کا گہرا شعور تھا۔انہیں خیالات کی تازگی،تخیل کی بلندی،روانی و سلاست،انداز نو اور سحر بیانی کی اہمیت کا گہرا احساس تھا۔اس سلسلے میں قطب مشتری کا ذکر کرنا بے حد ناگزیر ہے۔ملا وجہی نے قطب مشتری میں ''در شرح شعر گوید'' کے عنوان کے تحت جو اشعار کہے ہیں ان میں شعر کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ملا وجہی شاعری میں ندرت،جدت اور ذاتی اپج کا قائل ہے۔وہ دوسروں کی تقلید کو پسند نہیں کرتا۔اس کے نزدیک حقیقی فن کا روہی ہے جو نئی بات پیدا کرتا ہے وہ اسلوب وخیال دونوں برابر کا درجہ دیتا ہے اس کا کہنا ہے کہ خیال موزوں ہو،معنی بلند ہوں اور اگر معنی میں زور ہے تو بات کا مزہ دوبالا و نرالا ہو جاتا ہے۔یہ نکتہ بڑی حد تک عہد حاضر کے خیالات سے مطابقت رکھتا ہے۔وہ کہتا ہے۔

حریص ہمیشہ ذلیل ہوتا ہے:

نکو کر تُوں لئی بولنے کا ہوس — اگر خوب بولے تو یک بیت بس
اگر فام ہے شعر کا تج کوں چھند — چنے لفظ لیا ہور معنی بلند
اگر خوب محبوب جیوں سور ہے — سنوارے تو نور علیٰ نور ہے
ہنروند اُس کو کھیا جائے گا — جکوئی اپنے دل سے نوا لیائے گا
نکو بول مضمون تُوں ہور کا — کہ کالا ہے دو جگ میں مُوں چور کا

وجہی اور دیگر مثنوی نگاروں نے قلم کی تعریف میں جن خیالات کو پیش کیا ہے وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ اس سے ان کے تنقیدی شعور اور فنی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے خیالات کی تشکیل وتعمیر میں اس عہد کے معاشرے اور ماحول کا بھی حصہ ہے۔عام طور پر مثنوی نگاروں نے اپنے خیالات اور تجربات کو بغیر کسی تکلف کے پیش کیا ہے۔ان کے انداز بیان میں سادگی اور روانی پائی جاتی ہے۔انہوں نے عمدہ تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کیا۔مختلف صنعتوں کا استعمال بھی بڑی عمدگی سے کیا ہے۔

محاوروں کا بھی برمحل استعمال کیا ہے۔اگر چہ مثنوی نگاروں نے اپنے قصوں کو دل چسپ بنانے کے لئے مافوق الفطرت عناصر کا سہارا لیا ہے لیکن اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی سچی تصویریں بھی پیش کی ہیں۔ان مثنویوں سے رسم ورواج، رہن سہن کے طریقے، ملبوسات اور زیورات، آلات موسیقی، عوام وخواص کی زندگی، ان کے اعتقادات ومیلانات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

02.08 خلاصہ

اس اکائی میں آپ کے لئے مثنوی کی تعریف اور اس کے عام طور پر استعمال ہونے والے اجزائے ترکیبی کو پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ مثنوی کے اقسام اور اس کے ساتھ ہی مثنوی کے اوزان بھی درج کیے گئے ہیں۔مثنوی کے فن پر بھی مفید گفتگو کی گئی ہے اور اسی کے تحت کردار نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری اور زبان وبیان جیسے نکات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اس کے علاوہ مثنوی کی اہمیت وافادیت پر بھی اجمالاً تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔کیوں کہ مثنوی ایک کارآمد اور اہم صنف سخن ہے جسے بیانیہ شاعری کی معراج بھی مانا گیا ہے۔اس کا دائرہ بہت ہی وسیع وکشادہ ہے اور مثنوی کہنے کے لئے غیر معمولی فنّی مہارت حاصل ہونی چاہیے۔امید کی جاتی ہے کہ اس سبق سے یقیناً آپ کے مثنوی کے تعلق سے معلومات میں مزید اضافہ ہوا ہوگا۔

02.09 فرہنگ

آگاہ	: جان کاری، معلومات	ستارہ بیں	: ستاروں کی حرکت دیکھنے والا
ابتدائی	: شروع کے	سرائے فانی	: دنیا
اجمالاً	: مختصر	شتابی	: جلدی
احاطہ	: گھیرا ہوا	ضعیف الاعتقاد	: کمزور عقیدے والے
اختتام	: ختم ہونا	طرز	: طریقہ، ڈھنگ
اختراع	: گڑھی ہوئی	عکاسی	: عکس اُتارنا
اسطوری	: افسانوی، کہانی	علم نجوم	: ستاروں کا علم
افادیت	: فائدہ	عوام الناس	: عام لوگ
انہماک	: غور وفکر	فال	: شگون
ایجاد	: وجود میں لانا، پیدا کرنا	کارآمد	: کام میں آنے والی
برہمن	: پنڈت	کمی وبیشی	: کم یا زیادہ ہونا

پندونصائح	: نصیحت وحکمت کی باتیں	مثنی	: دو، دو
تاروپود	: تانااور بانا	مرگ	: موت
تخلیق کار	: لکھنے والا، پیدا کرنے والا	مروجہ	: رواج پایا ہوا، چلتا ہوا
تصویرکشی	: شکل بنانا	مرہون منت	: احسان مند
تقاریب	: تقریب کی جمع، خوشی کی محفل	مسحورکن	: جادو پیدا کرنے والی
تنوع	: قسم قسم کے	مسلّم	: تسلیم کیا ہوا
جاگیر	: زمین	مطول	: لمبی، طویل
جدید	: نئی یا نیا	معنی آفرینی	: معنی پیدا کرنے والی
جشن طرب	: خوشی کی محفل	مفید	: فائدہ مند
حریص	: لالچی	مناجات	: التجائیہ یا دعائیہ کلام
حزنیہ	: رنج وغم سے آراستہ	منفرد	: الگ
حمد	: خدائے تعالیٰ کی تعریف	منقبت	: نیک بندوں کی شان میں لکھا گیا کلام
خلعت	: جوڑے وغیرہ	مہ جبیں	: چاند سا چہرہ
خواص	: خاص لوگ	نعت	: حضور ﷺ کی شان کہا ہوا کلام
داغ بیل	: بنیاد، نیو	نکات	: نکتہ کی جمع، خاص باتیں
رزم وبزم	: جنگ اور خوشی کی مجلس	نیرنگی	: فریب، جادو
رسومات	: رسم کی جمع، عادت، ریت	وسیع وکشادہ	: بہت بڑا
رمال	: علم رمل	ہنگامہ آرائی	: ہنگامہ برپا کرنا
رنگارنگی	: طرح طرح کے	ہیولیٰ	: شکل وصورت
سبب تالیف	: لکھنے کی وجہ	ہیئت	: مخصوص اوزان یا شکل

02.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱۔ مثنوی کا تعارف پیش کیجیے؟

سوال نمبر۲۔ مثنوی کے اجزائے ترکیبی تحریر کیجیے؟

سوال نمبر۳۔ مثنوی میں جذبات ومنظر نگاری پر اپنا اظہارِ خیال کیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱۔ مثنوی کے اقسام پر ایک مضمون رقم کیجیے؟

سوال نمبر۲۔ مثنوی میں عام طور کتنی بحریں استعمال کی جاتی ہیں؟

سوال نمبر۳۔ مثنوی میں تہذیب اور سماجی زندگی کی کیا اہمیت ہے؟ تحریر کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : مثنوی کس زبان کا لفظ ہے؟

(الف) عربی (ب) اردو (ج) فارسی (د) ترکی

سوال نمبر۲ : ''مثنوی'' کا لغوی معنی کیا ہے؟

(الف) ایک، دو (ب) دو، دو (ج) دو، تین (د) تین، چار

سوال نمبر۳ : ''جنت سنگھار'' کس شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) غواصی (ب) نصرتی (ج) ہاشمی (د) ملک خوشنود

سوال نمبر۴ : ہاشمی کی مثنوی ''یوسف وزلیخا'' کتنے اشعار پر مشتمل ہے؟

(الف) ۵۱۳۹ (ب) ۵۱۴۰ (ج) ۵۱۴۱ (د) ۵۱۴۲

سوال نمبر۵ : ڈاکٹر سید عبداللہ نے دکنی مثنوی کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟

(الف) ۴ (ب) ۵ (ج) ۶ (د) ۷

سوال نمبر۶ : امداد امام اثرؔ نے موضوع کے اعتبار سے مثنوی کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا ہے؟

(الف) ۵ (ب) ۶ (ج) ۷ (د) ۸

سوال نمبر۷ : حسن شوقؔی کی مثنوی کون سی ہے؟

(الف) گلشنِ عشق (ب) میزبانی نامہ (ج) جنت سنگھار (د) قطب مشتری

سوال نمبر۸ : مختلف کھانوں، ترکاریوں اور مٹھائیوں کا ذکر کس شاعر نے اپنی مثنوی میں کیا ہے؟

(الف) ملّا وجہی (ب) نصرتی (ج) حسن شوقی (د) فضلی

سوال نمبر۹ : کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں ☆ سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں ..... یہ شعر کس مثنوی کا ہے؟

(الف) قولِ غمین (ب) رموز العارفین (ج) گلزارِ نسیم (د) سحر البیان

سوال نمبر۱۰ : زیورات کا ذکر ذیل میں سے کس مثنوی میں ہے؟

(الف) ابراہیم نامہ (ب) میزبانی نامہ (ج) یوسف وزلیخا (د) گلشنِ عشق

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (الف) عربی	جواب نمبر۶	: (الف) ۵
جواب نمبر۲	: (ب) دو،دو	جواب نمبر۷	: (ب) میزبانی نامہ
جواب نمبر۳	: (د) ملک خوشنود	جواب نمبر۸	: (ب) نصرتی
جواب نمبر۴	: (د) ۵۱۴۲	جواب نمبر۹	: (د) سحرالبیان
جواب نمبر۵	: (ج) ۶	جواب نمبر۱۰	: (الف) ابراہیم نامہ

02.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو شاعری کا مزاج از وزیر آغا

۲۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں از ڈاکٹر گیان چند جین

۳۔ اردو مثنوی کا ارتقا از عبدالقادر سروری

اکائی 03 دکنی مثنویات کا جائزہ

ساخت

03.01 : اغراض ومقاصد

03.02 : تمہید

03.03 : دکن میں اردو مثنوی کی ابتدا اور ابتدائی دور کی اہم مثنویات

03.04 : عادل شاہی دَور کی مثنویات کا جائزہ

03.05 : قطب شاہی دَور کی مثنویات کا جائزہ

03.06 : دکنی مثنویات کا جائزہ

03.07 : دکن میں اردو مثنوی کی مقبولیت کم ہونے کے اسباب

03.08 : خلاصہ

03.09 : فرہنگ

03.10 : سوالات

03.11 : حوالہ جاتی کتب

03.01 اغراض ومقاصد

یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ مثنوی شاعری کی مقبول اور انتہائی کارآمد صنف ہے۔مخصوص نظام قوافی اور کسی خاص موضوع تک محدود نہ ہونے کی بنا پر ہر دَور کے شعرا نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔مثنوی نے ایک طویل ارتقائی سفر طے کیا ہے۔اس کی ابتدا کا سفر سرزمین دکن سے شروع ہوتا ہے دکن میں اردو مثنوی نے اِرتقا کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔اس سبق کی غرض وغایت آپ کو سرزمین دکن میں مثنوی کے ارتقائی سفر سے واقف کرانا ہے اور سرزمین دکن میں تخلیق ہونے والی مثنویات کے موضوعات اور دوسری فکری وفنّی خصوصیات سے روشناس کرانا ہے اس کے علاوہ دکن میں اردو شاعری کے مختلف ادوار میں لکھی جانے والی مثنویات اور مثنوی نگار شعرا سے متعارف کرانا ہے اور دکن کی اردو شاعری کے فروغ میں مثنوی نے جو حصہ لیا ہے اس سے واقف کرانا ہے۔

دکنی مثنویات کے جائزے میں آپ دیکھیں گے کہ دکن میں تخلیق کی گئی مثنویات میں جہاں ابتدا میں مذہب کا غلبہ رہا وہیں بعد میں دوسرے بہت سے موضوعات بھی داخل ہوئے جس کی وجہ سے دکنی عہد کی مثنویات اپنے عہد کی زندگی، معاشرت، تہذیب وتمدن اور طرزِ فکر کی آئینہ دار بھی ہیں اور اس زمانے کے فنی معیار اور زبان و بیان کی خصوصیات کی ترجمان بھی ہیں۔دکن کی مثنویات کے جائزہ کے دوسرے مقاصد میں دکن میں اردو شاعری کے مختلف رجحانات اور شعری زبان کی تبدیلیوں سے واقفیت بہم پہنچانا بھی ہے۔

03.02 تمہید

اردو زبان کا آغاز اگر چہ دہلی میں ہوا تھا لیکن اس نے ادبی راہ سرزمین دکن میں حاصل کی اس کی ایک وجہ اگر دہلی میں فارسی زبان کی عمل داری تھی تو دوسرا سبب دکن میں فارسی جیسی کوئی ترقی یافتہ زبان نہ ہونا تھا چنانچہ اردو شعروادب کے ابتدائی نمونے دکن میں ہی ملتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ابتدا میں اردو زبان کا زیادہ استعمال تبلیغِ مذہب اور دینی معاملات اور مسائل سے واقف کرانے کے لئے کیا گیا اس لئے اردو شعروادب کے ابتدائی نمونوں پر تصوّف اور مذہب کا غلبہ نظر آتا ہے۔

جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے چوں کہ اردو شاعری کا آغاز فارسی شاعری کے زیرِ اثر ہوا تھا۔ اس لئے شاعری میں وہی اصناف اختیار کی گئیں جو فارسی میں مروّج اور مقبول تھیں۔ مثنوی ہی ایک ایسی صنف ہے جو فارسی کے زیرِ اثر اردو میں رائج ہوئی۔ جس دور میں اردو شاعری نے اِرتقا کا سفر شروع کیا اس زمانے میں فارسی میں مثنوی کو بڑا فروغ حاصل تھا اور بے حساب موضوعات رزم، بزم، معرفت، سلوک، تصوف، اخلاق وعشق وغیرہ پر مثنویات کا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ فارسی میں بیانِ رزم میں ''شاہنامہ، سکندر نامہ اور حملۂ حیدری''، داستان محبت میں ''یوسف وزلیخا اور شیریں خسرو''، قصص وحکایات میں 'ہفت پیکر، ہشت بہشت''، تعلیم اور اخلاق میں ''بوستاں'' اور تصوف کے سلسلہ میں ''مثنوی معنوی'' فارسی کی شاہ کار مثنویات ہیں۔ ان مثنویات کی مقبولیت نے شعرائے دکن کو مثنوی نگاری کی طرف راغب کیا۔

اردو میں مثنوی کی اِبتدا سے متعلق جو مباحث ملتے ہیں ان میں زیادہ تر محققین کا خیال ہے کہ اردو مثنوی کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو'' اور عبدالقادر سرورؔی نے ''دکن میں اردو مثنوی کا اِرتقا'' میں اس رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن بعض محققین نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد عقیل نے ''اردو مثنوی کا اِرتقا'' میں شواہد پیش کر کے شمالی ہند کے حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کو اردو کا قدیم ترین مثنوی نگار قرار دیا ہے۔ اس بحث سے قطعِ نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اردو مثنوی نگاری کی با قاعدہ اِبتدا فارسی مثنوی کی تقلید میں سرزمین دکن میں ہوئی۔

ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے:

''اردو کا دکنی عہد مثنوی کا دَور ہے۔'' اردو مثنوی شمالی ہند میں، ص.۱۱۸

دکن میں اردو مثنوی کے اِرتقا کا زمانہ تقریباً ڈھائی سو سال کی مدت پر محیط ہے مؤرخین ادب نے دکن میں اردو شعروادب کے اِرتقا کے زمانے کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دکن میں اردو مثنوی کے ارتقاء کو مطالعہ کی آسانی کی غرض سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا ابتدائی دور جسے بہمنی دور بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرا دور بہمنی حکومت کا شیرازہ بکھرنے کے بعد شروع ہوا اور ۱۱۰۱ھ میں مغلیہ اقتدار قائم ہونے تک جاری رہا۔ دکن میں اس دوسرے دور میں گول کنڈہ کی قطب شاہی اور بیجاپور کی عادل شاہی سلطنتوں کے زیرِ سایہ اردو مثنوی نگاری کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

03.03 دکن میں اردو مثنوی کی ابتدا اور ابتدائی دور کی اہم مثنویات

سرزمین دکن میں اردو شعروادب کا آغاز بہمنی دور حکومت ۷۴۸ھ (۱۳۴۷ء) تا ۹۰۰ھ (۱۴۹۵ء) کے دوران میں ہوا تھا۔ اسی زمانے میں اردو مثنوی نگاری کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ بہمنی دورِ حکومت کے آخری زمانے میں لکھی گئی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' دکن کی سب

سے قدیم دَست یاب شدہ مثنوی ہے۔مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا مثنوی نگار نظامؔی ہے۔مثنوی کے زمانۂ تخلیق کے بارے میں محققین کے درمیان میں اختلاف رائے ہے۔نصیر الدین ہاشمی نے مثنوی کے زمانۂ تصنیف کا تعین کرتے ہوئے اس کی تصنیف کا زمانہ ۸۶۵ھ سے ۸۶۷ھ قرار دیا ہے۔سنِ تصنیف کے علاوہ مثنوی کے اشعار کی تعداد کے سلسلہ میں بھی محققین کے درمیان اختلافات ہیں لیکن جمیل جالبؔی نے اس مثنوی کو اِیڈٹ کر کے ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع کیا ہے اس میں ایک ہزار بتیس مکمل اشعار اور ایک شعر نامکمل حالت میں شامل ہے۔مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں لکھی گئی ہے۔سلطان احمد شاہ سلطان علاء الدین ہمایوں شاہ کا فرزند تھا اور اس کا لقب نظام شاہ تھا۔مثنوی نگار نے اسی لقب کی رعایت سے اپنا تخلص نظامؔی رکھا ہے اس کا اصلی نام فخر دین تھا۔

مثنوی کا اصل موضوع اخلاقیات ہے۔مثنوی کی ابتدا حمد،نعت اور منقبت صحابہ سے ہوئی ہے اس کے بعد سلطان علاء الدین ہمایوں کی تعریف اور اس کے بعد اصل قصہ شروع ہوا ہے۔مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا قصہ سنسکرت ادب سے خوشہ چینی کا غماز ہے۔قصہ میں تبدیل قالب سے پیدا ہونے والے واقعات سے مثنوی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کے اصل کردار کدم راؤ ناگ راجہ اور پدم راؤ اس کا وزیر تھا۔مثنوی کا عنوان ان دونوں کے نام پر ہی ''کدم راؤ پدم راؤ'' اختیار کیا گیا ہے۔قصہ میں جوگیوں وسنیاسیوں کے مکرو فریب، ریاکاری، حرص وہوس کو بے نقاب کیا گیا ہے اور وفاداری، راست بازی، سادہ دلی، نیکی اور سچائی وغیرہ کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ قصہ کا کردار اکھر ناتھ جوگی، جوگیوں کے مکروفریب کا ترجمان ہے جس نے کدم راؤ کو قالب تبدیل کرنے کا راز بتا دیا تھا۔ایک دن راجہ جب طوطے کے قالب میں تھا اکھر ناتھ نے عیش وعشرت کی زندگی گزارنے کے لالچ میں راجہ کا قالب اختیار کر لیا۔وزیر پدم راؤ کو طوطے کی مدد سے جو کدم راؤ تھا حقیقت کا پتہ چلا تو اس نے اپنی ذہانت سے کدم راؤ کو اس کے اصلی قالب میں آنے میں مدد کر کے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔

مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا قصّہ ہندوستانی لوک کہانیوں کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور قدیم ہندوستانی طرز فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں اس عہد کی معاشرتی زندگی کی جھلکیوں اور ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی جا بجا ملتی ہے۔مثنوی سے اس دور میں اُردو زبان کے اِرتقا کا بھی اندازہ ہوتا ہے جب زبان ادبی معیار کی منزل کی جانب گام زَن تھی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں بیک وقت بہت سی زبانوں مثلاً سنسکرت، پنجابی، سندھی، کھڑی، برج، گجراتی، راجستھانی اور مراٹھی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔اس کے علاوہ نظامی نے مثنوی میں اسلوب اور پیرایہ بیان کو موثر بنانے اور معنویت میں اضافہ کرنے کے لئے مقامی کہاوتوں اور محاوروں سے بھی مدد لی ہے۔جس کی وجہ سے زبان مشکل ہوگئی ہے اور اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔مثنوی اس عہد کے تہذیب وتمدن کی عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ دکن میں اردو کی پہلی طویل مثنوی ہونے کی بنا پر خاص اہمیت رکھتی ہے۔

دکن میں کیوں کہ اردو شاعری کی اِبتدا صوفیائے کرام اور درویشوں کے سائے میں ہوئی تھی اس لئے ابتدائی دور کی مثنویوں میں معرفت، سلوک، تصوف کے معاملات اور مذہبی عقائد کو موضوع بنایا گیا ہے۔جس کی بنا پر اس دور کی مثنویات عموماً ادبی حسن سے عاری ہیں۔ اس ابتدائی دور کی مثنویات میں اشرفؔ کی ''نوسرہار'' ۹۰۹ھ، فیروز بیدریؔ کی ''پرت نامہ'' اور ''توصیف نامہ میران محی الدین'' شاہ میراں جی شمس العشاقؔ کی ''مغز مرغوب، خوش نامہ، خوش نغز'' اور ''شہادت الحقیقت'' شاہ برہان الدین جانمؔ کی مختصر مثنویوں کے ساتھ طویل مثنوی ''ارشاد نامہ'' اور شیخ محمد چشتیؔ کی طویل مثنوی ''خوب ترنگ'' اور ''قصص الانبیاء'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

شاہ میراں جی شمس العشاق کی مثنویات ''مغز مرغوب، خوش نامہ، خوش نغز'' میں معرفت وسلوک کے مسائل واضح کیے گئے ہیں۔ مثنوی ''خوش نامہ'' میں ایک نوجوان لڑکی خوش یا خوشنودی کا قصہ بیان کیا گیا ہے یہ لڑکی دوسری لڑکیوں کی طرح شوخ وشنگ نہیں تھی اور بناؤ سنگھار کی جگہ خدا کی محبت میں ڈوبی ہوئی تھی اور صرف سترہ سال کی عمر میں اس کی وفات ہوگئی۔اس کی موت کے واقعہ سے میراں جی نے اخلاقی نتائج نکالے اور روحانی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔''خوش نغز'' میں بھی دوشیزہ کا ذکر ہے۔اس میں دوشیزہ شاہ صاحب سے عرفان، روح، عقل، عشق اور مراقبہ کے بارے میں سوالات کرتی ہے اور وہ ہر ایک کا جواب نئے باب میں دیتے ہیں۔اس طرح یہ مثنوی مکالماتی انداز کے نو ابواب پر مشتمل ہے۔

میراں جی کی طویل مثنوی ''شہادت الحقیقت یا شہادت التحقیق'' ہے یہ ۵۶۳/اشعار پر مشتمل ہے اس میں تصوّف ومعرفت کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔شہادت الحقیقت کی اِبتدا حمد کے اشعار سے ہوتی ہے پھر نعت اور منقبت کہی گئی ہے۔منقبت میں میراں جی نے اپنے پیر کی مدح کی ہے اس کے بعد صوفیانہ تصورات کی وضاحت کی ہے۔اس مثنوی میں میراں جی نے شاعری میں زبان ومعنی کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور ''ہندی بولوں'' کو عربی وفارسی زبان پر ترجیح دینے کا اعتراف کیا ہے کیوں کہ اسے ہر کس وناکس سمجھ سکتا ہے۔شہادت الحقیقت میں میراں جی نے شریعت اور طریقت کی تشریح کرتے ہوئے آیات واحادیث کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔کہیں کہیں تلمیحات سے بھی کام لیا ہے۔مثنوی کی زبان پیش روؤں کے بہ نسبت آسان ہے۔

اشرفؔ کی ''نوسرہار'' ۹۰۹ھ نو ابواب پر مشتمل ہے۔غالباً اسی لئے اسے ''نوسرہار'' کہا گیا ہے اس میں واقعۂ کربلا کو خیر وشر کا تصادم قرار دینے کے بجائے عشق ومحبت سے پیدا رقابت کو واقعہ کا باعث قرار دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں مثنوی میں مشہور ومقبول واقعات کے بجائے نئی روایات شامل کر لی گئی ہیں۔اردو ادب میں ''نوسرہار'' کی لسانی اور تاریخی اہمیت زیادہ ہے۔مثنوی میں عہد کی زبان کے محدود سرمایہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا ہے اور روزمرّہ اور محاورات کو حسبِ ضرورت استعمال کیا ہے۔مثنوی میں واقعات کی موثر تصویر کشی اور اثر انگیز جذبات نگاری کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔اشرف نے مثنوی کی زبان کو کہیں ہندی اور کہیں ہندوی کہا ہے۔

مثنوی ''پرت نامہ'' کے مصنف فیروز کا اصل نام قطب الدین قادری تھا۔فیروزؔ اس کا تخلص تھا۔''پرت نامہ'' میں فیروز نے اپنے روحانی رہبر مخدوم جی سے اپنی والہانہ عقیدت مندی اور جذباتی وابستگی کا ذکر کیا ہے۔فیروزؔ نے ''پرت نامہ'' کے آخر میں اشعار کی تعداد ۱۲۱/ بتائی ہے لیکن بعد میں ۱۲۰/اشعار ہی دَست یاب ہو سکے ہیں۔مثنوی میں مثنوی نگار نے اپنے خواب کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے شیخ عبدالقادر جیلانی کو دیکھا اور انہیں اپنے مرشد کا ہی ہم شبیہ پایا۔''پرت نامہ'' جسے ''توصیف نامہ'' سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح کی ہے اور اپنے پیر ومرشد شیخ ابراہیم جی کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔فیروز نے اپنی مثنوی میں اپنے مرشد کے لئے ''محی الدین دوجے'' کا لقب استعمال کیا اور ان کے علم باطن اور ولایت وعظمت کو سراہا ہے مثنوی کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں قیاس ہے کہ ۹۴۰ھ سے پہلے لکھی گئی تھی۔''پرت نامہ'' میں وہی لسانی خصوصیات نظر آتی ہیں جو اس دور کی زبان کی خاصہ تھی۔مثنوی کے اشعار میں روانی اور طرز ادا میں شگفتگی سے فیروز کے زبان وبیان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس دَور کی ایک اور مثنوی ''ارشادنامہ'' ۹۹۰ھ کے مصنف شاہ برہان الدین جانؔم ہیں۔ مثنوی ۲۲۲۰/اشعار پر مشتمل ہے اس میں حمد ونعت کے بعد جانم نے اپنے پیرومرشد اور والد میراں جی کی مدح کی ہے پھر تصوف کے مضامین نظم کیے ہیں۔ ''ارشادنامہ'' کے تمام مضامین کی نوعیت مذہبی اور نیم فلسفیانہ ہے۔ ''ارشادنامہ'' کی زبان کو جانم نے ''ہندی زبان'' کہا ہے۔ مثنوی کی زبان میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے لیکن بیان میں سادگی اور روانی ملتی ہے۔ ''ارشادنامہ'' کے علاوہ جانم کی دوسری مثنویات ''وصیت الہادی، حجت البقا، نسیم الکلام'' اور ''منفعت الایمان'' ہیں۔ یہ بھی مذہبی مثنویاں ہیں لیکن ان کی زبان مشکل ہے۔

دکن کے ابتدائی دور کی مثنویوں میں خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' ۹۴۶ھ اہم مثنویات میں شمار کی جاتی ہے یہ ایک طویل اور مکمل مثنوی ہے۔ پوری مثنوی میں تصوف کے مسائل نظم کیے گیے ہیں اور حسب موقع تمثیلی حکایات سے ان کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان حکایات میں شیخ چلّی کی حکایت بھی ہے لیکن سب سے زیادہ مشہور حکایت صفائی قلب کے سلسلہ میں ہے جس میں چین کے باکمال مصوّروں کے اس گروہ کی ہے جو اُڑتے مور کی تصویر بنا دیتا تھا۔ خوب ترنگ کی زبان ہندی زدہ ہے لیکن مسائل کی وضاحت میں عربی وفارسی الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔

دکن میں اردو مثنوی کے اِرتقا کا ابتدائی دور جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ اردو شاعری کے اِرتقا کا ابتدائی دور تھا جس پر مذہب اور تصوف کے معاملات اور مسائل کا غلبہ تھا چنانچہ دکن کے ابتدائی دور کی بیش تَر مثنویات میں مذہبی معاملات اور مذہبی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے اور صوفیائے کرام اور مبلغین دین کے اکابرین کی تعریف کی گئی ہے اور ان کے رشد وہدایت کی خدمات کے ساتھ ان کے نظریات کی وضاحت کی گئی ہے اس دور میں چوں کہ اردو زبان بھی ادبی اِرتقا کے ابتدائی دور میں تھی اور شاعری کا مقصد فن کاری کے نمونے پیش کرنے کے بجائے مذہبی معلومات بہم پہنچانا تھا اس لئے مقامی الفاظ کا استعمال زیادہ کیا گیا اور فارسی وعربی الفاظ کے بجائے ہندی الفاظ کو ترجیح دی گئی جس کی بنا پر مثنویات میں وہ شعری محاسن کم نظر آتے ہیں جو مثنویات کی زبان وبیان میں ادبیت کا رنگ میں اضافہ کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود سادگی، سلاست اور روانی اور اثر آفرینی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

دکنی مثنویات میں ادبیت اور شعری وفنی خوبیوں کی کارفرمائی کا زمانہ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد خودمختار حکومتوں کے قیام کے بعد شروع ہوتا ہے ان خودمختار سلطنتوں میں بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت اور گول کنڈہ کی قطب شاہی سلطنت ایسی سلطنتیں تھیں جن کے سلاطین نے نہ صرف علم وادب کی سرپرستی کی بلکہ علم وادب اور شعروسخن کے فروغ میں خود بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اس بنا پر اس دور میں نہ صرف اردو شعرو ادب کا بڑا ذخیرہ وجود میں آیا بلکہ مختلف اصناف شاعری نے ترقی کی نئی منزلیں طے کیں اور ان کا ایک ادبی معیار قائم ہوا۔ ان مختلف اصناف شاعری میں مثنوی بھی شامل ہے۔ ذیل میں بیجاپور کی عادل شاہی دور کی اہم مثنویات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

03.04 عادل شاہی دَور کی مثنویات کا جائزہ

عادل شاہی حکومت کا زمانہ ۸۹۵ھ سے ۱۰۹۷ھ تک کے زمانہ پر محیط ہے۔ اس دور میں نو سلاطین نے بیجاپور میں حکومت کی۔ بیجاپور میں عادل شاہی حکومت کے بانی یوسف عادل شاہ کو شعروسخن سے بڑی دل چسپی تھی۔ اس کے دَور میں ایران وعراق جیسے بیرون ممالک سے اصحابِ علم وفن بیجاپور آئے جن کی وجہ سے بیجاپور میں شعروسخن کا مزاج عام ہوگیا اور دیگر اصناف شاعری کے ساتھ مثنوی نگاری کو بھی فروغ

حاصل ہوا۔ عادل شاہی دور کی قابلِ ذکر مثنویات میں عبدلؔ کی ابراہیم نامہ، مقیمیؔ کی چندر بدن ومہیار، امینؔ کی بہرام وحسن بانو، شوقیؔ کی فتح نامہ نظام شاہ اور میزبانی نامہ صنعتیؔ کی قصۂ بے نظیر اور گلدستہ، ملک خوشنودؔ کی ہشت بہشت، رستمیؔ کی خاور نامہ، شاہیؔ کی خیبر نامہ، نصرتیؔ کی علی نامہ اور گلشن عشق، ہاشمیؔ کی یوسف وزلیخا، مختارؔ کی معراج نامہ اور مولود نامہ، قدرتیؔ کی قصص الانبیاء، مومنؔ کی اسرار عشق اور قادر کی معجزۂ خاتون جنت ہیں۔

ان میں عبدلؔ کی مثنوی ''ابراہیم نامہ'' دکن کے اوّلین ادبی کارناموں میں خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ابراہیم نامہ کا ہیرو ابراہیم عادل شاہ ثانی ہے اس مثنوی کی ادبی اہمیت کے ساتھ تاریخی اہمیت بھی ہے چوں کہ اس میں عبدل نے بیجاپور کے چھٹے فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ اس کے عہد کی تہذیبی ومعاشرتی قدروں اور اس دَور کی زندگی کے دوسرے معاملات کو بھی پیش کیا ہے۔ مثنوی میں قصیدہ کی سی تخیلی رنگ آمیزی اور شاعرانہ طرز نگارش کے اعلیٰ نمونے اس مثنوی کی ادبی قدر وقیمت کے ضامن ہیں۔

مقیمیؔ کی مثنوی ''چندر بدن ومہیار'' ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۴۸ھ کے درمیان کی تخلیق ہے۔ یہ مثنوی مہیار نامی شخص اور ہندو لڑکی چندر بدن کی داستان عشق پر مشتمل ہے یہ داستان اس عہد میں زبان زد خاص وعام تھی۔ ''چندر بدن ومہیار'' میں مقیمی نے قصہ میں غیر ضروری تفصیلات کے بیان سے پرہیز کر کے واقعات پر زیادہ توجہ دی ہے اس کے باوجود اس میں ہندو معاشرت کی اچھی عکّاسی ملتی ہے۔ مثنوی میں سادگی، روانی اور بے ساختگی کے نمونے جابجا ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ تشبیہات واستعارات اور علائم سے بیان کو دل کشی عطا ہوئی ہے۔ مثنوی کی مقبولیت کا اصل سبب قصہ کی دل چسپی اور بیان کی روانی اور تسلسل میں مضمر ہے۔

صنعتیؔ کی مثنوی ''قصّۂ بے نظیر'' داستانی انداز اور طلسماتی فضا کی پہلی اردو مثنوی ہے۔ اس کی تصنیف ۱۰۵۵ھ میں ہوئی تھی۔ اس کا قصہ مہماتی طرز کا قصہ ہے جس میں صحابی رسول تمیم انصاری کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ مثنوی بارہ مقامات پر مشتمل ہے۔ ہر مقام سے ایک نئی مہم کا آغاز ہوتا ہے۔ صنعتیؔ نے قصہ میں جذبۂ عقیدت مندی، روایات اور مافوق الفطرت عناصر کو بڑے سلیقے سے آمیز کیا ہے اور خیر وشر کے تصادم کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ ''قصۂ بے نظیر'' میں رزمیہ مناظر بھی ہیں، بزم کے نقشے بھی، فطری مناظر کی عکاسی بھی اور سراپا نگاری بھی ہے۔ سب میں ہی صنعتیؔ نے قوت اظہار، زور بیان اور فن شاعری میں مہارت کا ثبوت دیا ہے جس کی بنا پر یہ مثنوی دکنی مثنویات میں خاص مقام رکھتی ہے۔

ملک خوشنودؔ کی مثنوی ''ہشت بہشت'' چوں کہ امیر خسروؔ کی ''ہشت بہشت'' کا چربہ ہے اس لئے محققین نے اسے یہی نام دیا ہے لیکن جمیل جالبیؔ نے تاریخ اردو جلد اول میں اس مثنوی کا نام ''جنت سنگار'' بتایا ہے۔ مثنوی ''جنت سنگار'' کا سنِ تصنیف ۱۰۵۶ھ ہے اس میں ۳۲۵۵/ اشعار شامل ہیں۔ مثنوی میں پہلے حمد پھر نعت اور نعت کے بعد معراج کا واقعہ بیان کیا گیا ہے پھر بادشاہ کی مدح میں شعر کہے گیے ہیں۔ پھر بہرام گور کی داستان بیان کی گئی ہے۔ مثنوی میں ملک خوشنودؔ نے قصہ در قصہ کی ٹیکنک اختیار کی ہے جس میں آٹھ کہانیاں نظم کی گئی ہیں۔ مثنوی کی زبان اور طرزِ بیان اس عہد کے دوسرے دکنی شعرا کی طرح اگر چہ مشکل اور پیچیدہ ہے لیکن تسلسل، روانی اور دوسرے شعری محاسن سے عاری نہیں ہے۔

رستمی کی مثنوی ''خاورنامہ'' ایک کامیاب رزمیہ مثنوی ہے۔ مثنوی ''خاورنامہ'' فارسی ''خاورنامہ'' جو ابن حسام نے فردوسی کے ''شاہ نامہ'' کے جواب میں تصنیف کیا تھا اس کا چربہ ہے۔ ''خاورنامہ'' میں رستمی نے فارسی زبان پر اپنے عبور کے ساتھ فن شعر گوئی میں اپنی مہارت اور قدرتِ بیان کا ثبوت دیا ہے۔ اس میں رزمیہ مناظر اور معرکہ آرائی کے واقعات کی عکاسی اور آلات حرب وضرب، گھوڑے وغیرہ کے سلسلہ کے بیانات میں رستمی کی فن کاری نمایاں ہے۔ خاورنامہ میں تلمیحات، تشبیہات اور استعارات میں مقامی رنگ کے بجائے عجمی رنگ نمایاں ہے اسی طرح تہذیب ومعاشرت کے بیان میں بھی ایرانی اثرات نظر آتے ہیں۔ زبان پر بھی فارسی تراکیب اور طرزِ ادا کا گہرا اثر ہے۔

نصرتی کی مثنویات ''گلشنِ عشق'' اور ''علی نامہ'' میں ''گلشنِ عشق'' ۱۰۶۸ھ میں تصنیف کی گئی تھی۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں منوہر اور مدمالتی کے عشق کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ ''گلشنِ عشق'' اپنے زبان وبیان اور فنّی خصوصیات کے لحاظ سے خاص معیار کی حامل ہے اور فارسی مثنوی کے معیار کے قریب نظر تی ہے۔ مثنوی میں نصرتی نے قصہ کی پیش کش، سراپا نگاری، کردار نگاری، جذبات نگاری، مناظر فطرت کی عکاسی، تہذیبی ومعاشرتی زندگی کی تصویر کشی میں اپنے شاعرانہ تخیل اور فن کاری کا ثبوت دیا ہے جس سے مثنوی میں بڑی اثر آفرینی اور دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔ مثنوی میں نصرتی کے قدرتِ بیان نے بڑا تسلسل اور روانی پیدا کردی ہے۔ خوب صورت تشبیہات واستعارات اور اشارات کے برمحل اور مناسب استعمال نے اس مثنوی کی ادبی قدر وقیمت میں بڑا اضافہ کیا ہے۔

نصرتی کی دوسری مثنوی ''علی نامہ'' ایک طویل وبسیط رزمیہ مثنوی ہے اس کی تصنیف ۱۰۷۶ھ میں عمل میں آئی تھی اس میں علی عادل شاہ کے سوانحی حالات بیان کیے گیے ہیں اور مغلوں اور شواجی سے عادل شاہ کی جنگوں کے مرقعے پیش کیے گیے ہیں۔ مثنوی میں قصہ گوئی، جنگوں کی مرقع نگاری، منظر کشی، جذبات نگاری، تہذیب اور معاشرت کی تصویر کشی میں شاعر کے وسیع مشاہدہ دیدہ وری اور بلند تخیل آفرینی کا پتہ چلتا ہے۔ زبان وبیان کی خوبیوں اور فنّی خصوصیات کے لحاظ سے بھی مثنوی ''عادل نامہ'' نصرتی کا غیر معمولی ادبی کارنامہ ہے۔

ہاشمی کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' پانچ ہزار ایک سو اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی ۱۰۹۹ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ ہاشمی نے یہ مثنوی اپنے مرشد سید شاہ ہاشم کی فرمائش پر کہی تھی۔ مثنوی قصہ کی پُر لطف پیش کش، زور تخیل، محاکات، منظر کشی، جذبات نگاری، جزئیات نگاری اور زور بیان کے لحاظ سے امتیازی مقام رکھتی ہے۔ عادل شاہی دور میں لکھی گئی ایک اور طویل مثنوی ''قصص الانبیاء'' ہے اس کا مصنف قدرتی تھا۔ اس کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ملتی ہیں مثنوی ''قصص الانبیاء'' دکن کی ضخیم مثنوی ہے یہ دس ہزار سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں حمد، نعت اور منقبت کے بعد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک اکیس انبیاء علیہ السلام کے حالات بیان کیے گیے ہیں۔ دَست یاب نسخہ میں حضور کی حبشہ کی ہجرت تک کا بیان ملتا ہے۔ مثنوی کے قصے کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ قدرتی نے قصّہ اسلامی تاریخ اور تفاسیر کی مدد سے خود ترتیب دیا ہے۔ مثنوی کی زبان سادہ اور بیان میں ربط وتسلسل اور روانی ملتی ہے۔

03.05 قطب شاہی دَور کی مثنویات کا جائزہ

دکن میں قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا جس نے ۹۲۴ھ ۱۵۱۸ء میں خود مختار حکومت قائم کی تھی اور گول کنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔ اس کے بعد اس خاندان کے سات اشخاص نے ۱۰۹۸ھ ۱۶۸۷ء تک حکمرانی کی۔ قطب شاہی دَور بھی اردو شاعری کے فروغ کے لئے بڑا بابرکت دَور رہا اس کے تقریباً تمام سلاطین نے علم وادب کی ترقی میں دل چسپی لی اور علما وشعرا کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی

جس کی بنا پر یہاں اردو شاعری کی مختلف اصناف نے اِرتقا کی منازل طے کیں جن میں ایک صنف مثنوی بھی ہے۔اس دَور کی مثنویوں میں شیخ احمد شریف کی طویل مثنوی ''یوسف زلیخا''، وجہی کی ''قطب مشتری''، غواصی کی ''سیف الملک و بدیع الجمال'' طوطی نامہ، مینا ستونتی کے علاوہ دوسری مثنویاں ''ماہ پیکر، معراج نامہ، پھول بن، بہرام وگل اندام'' قابلِ ذکر ہیں۔

مثنوی ''قطب مشتری'' کا مصنف دکن کا اعلیٰ پایہ کا شاعر اور نثر نگار وجہی ہے اس نے یہ مثنوی ۱۰۱۸ھ میں لکھی تھی۔اس مثنوی میں قلی قطب شاہ کو ہیرو تصور کر کے بھاگ متی کے ساتھ عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ بھاگ متی ایک افسانوی کردار ہے۔ وجہی نے محمد قلی قطب شاہ کے واقعات زندگی اس کے حسن اور شخصیت کی دوسری خصوصیات لیاقت، شجاعت، دلیری، حوصلہ مندی وغیرہ کو پیش کرنے کے لئے یہ افسانہ تراشا ہے اور بعض لوک کہانیوں کے اجزاء کو مربوط کر کے پلاٹ کا تانا بانا تیار کیا ہے۔مثنوی میں کرداروں کی بھرمار ہے لیکن کردار نگاری معمولی ہے۔مثنوی میں سراپا نگاری میں وجہی نے اپنی فن کاری دکھائی ہے لیکن جذبات نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری میں کوئی خصوصیت نظر نہیں آتی ،قطبِ مشتری اپنے زمانے کی تہذیب ومعاشرت اور بیان کی سادگی بے تکلفی، بے ساختگی، ربط وتسلسل اور فنّی خصوصیات کے لحاظ سے دکنی مثنویات میں انفرادیت کی حامل ہے۔

''مثنوی' سیف الملوک وبدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' کا مثنوی نگار غواصی قطب شاہی دور کا ممتاز شاعر تھا۔''سیف الملوک و بدیع الجمال'' ۱۰۳۵ھ کی اور ''طوطی نامہ'' ۱۰۴۹ھ کی تصانیف ہیں۔''سیف الملوک اور بدیع الجمال'' کا قصہ ''الف لیلہ'' سے ماخوذ ہے اور ''طوطی نامہ'' کا قصہ بھی ضیاء الدین نخشبی کے فارسی قصہ ''طوطی نامہ'' کا ترجمہ ہے۔غواصی کی ایک اور مثنوی ''مینا ستونتی'' بھی ہے اس کا قصہ ہندوستان کی قدیم ''پریم کتھا'' سے ماخوذ ہے۔اس مثنوی میں غواصی نے بعض نصیحت آمیز باتیں اور اخلاقی نکات بیان کیے ہیں۔مثنوی ''سیف الملوک اور بدیع الجمال'' میں غواصی نے مسلسل واقعات کی موثر عکاسی کے ساتھ سراپا نگاری اور سیرت نگاری میں بڑی فن کاری دکھائی ہے۔مثنوی میں غواصی نے منظر نگاری اور واقعات کے بیان میں بھی اپنے وسیع مشاہدہ اور باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔مثنوی کی زبان سلیس اور شستہ ہے لیکن لب ولہجہ اور لفظیات پر فارسی کے گہرے اثرات ہیں۔

مثنوی ''ماہ پیکر'' کا مصنف احمد جنیدی تھا۔مثنوی ۱۰۶۴ھ میں مکمل ہوئی تھی اس مثنوی میں ماہ اور پیکر کی داستانِ عشق بیان کی ہے قصہ کا ہیرو پیکر اور محبوبہ ماہ ہے۔مثنوی میں ماہ نور کی علامت اور پیکر عشق کی علامت کے طور پر استعمال کیے گیے ہیں۔یہ مثنوی ۲۷۳۵/اشعار پر مشتمل ہے۔مثنوی دکن میں قطب شاہی عہد کی طرز زندگی، طرزِ معاشرت، تہذیب وتمدّن، رسم ورواج کی بہترین عکاسی کرتی ہے جس سے شاعر کے وسیع مشاہدہ اور گہرے سماجی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ماہ پیکر میں اچھوتی اور بلیغ تراکیب، دل کش تشبیہات، نادر استعارات، محاورات اور مقامی روزمرّہ کا موزوں ومناسب استعمال ہوا ہے۔زبان میں ہندی الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔بیان میں تسلسل، روانی اور شگفتگی ملتی ہے۔

مثنوی ''معراج نامہ'' کے مصنف کا نام سید بلاقی تھا۔اس کا سن تصنیف ۱۰۶۵ھ ہے۔مثنوی میں پانچ سو پچیس اشعار شامل ہیں۔ مثنوی میں معراج کے واقعہ کو داستانی انداز میں نظم کیا گیا ہے اور حمد کے بعد قصہ کو گیارہ مختلف عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔مثنوی میں زبان و بیان کی خوبیوں کے نمونے جا بجا ملتے ہیں۔مثنوی ''پھول بن'' دکن کی مقبول مثنویات میں سے ایک ہے اس کے مصنف شیخ محمد مظہر الدین ابن

نشاطیؔ تھے۔''پھول بن'' کا سن تصنیف ۱۰۶۶ھ ہے۔''پھول بن'' کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی ۱۷۴۴ اشعار پر محیط و مشتمل ہے۔ ''پھول بن'' کا قصہ فارسی سے مستعار ہے اور احمد حسن دبیرؔ کے فارسی قصہ ''بساتین الانس'' سے ماخوذ ہے۔

''پھول بن'' میں تین قصوں کے علاوہ تین تعارفی خاکے بھی شامل ہیں۔اس کے تمام قصے ایک ''زاہد'' سے منسوب کر دیے گیے ہیں اور ان میں معرفت کی باتیں تمثیلی پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔''پھول بن'' فنی اور ادبی اعتبار سے دکنی مثنویات میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔ مثنوی میں قطب شاہی عہد کی تہذیبی و مجلسی زندگی اور طرز معاشرت کی دل کش تصویر کشی کے بہترین نمونے ملتے ہیں اس کی ایک اور بڑی خوبی زبان و بیان کی سادگی بھی ہے۔

''مثنوی بہرام و گل اندام'' طبعی کی مثنوی ہے اس کا سن تصنیف ۱۰۸۱ھ ہے اس میں ایران کے بادشاہ گورؔ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی میں قصہ کی ترتیب و تسلسل ،واقعات میں ربط کے لحاظ سے اس کا پلاٹ بڑا مربوط ہے اس کے علاوہ کردار نگاری، منظر نگاری، سراپا نگاری، جذبات نگاری، نازک خیالی ،طرز ادا کی بیساختگی و روانی اور زبان کی سادگی و اثر انگیزی کے لحاظ سے یہ منفرد مقام رکھتی ہے۔ مثنوی کے مطالعہ سے طبعی کے وسیع مشاہدہ کے ساتھ زبان و بیان پر اس کی قدرت اور فنی چابک دستی کا پتہ چلتا ہے۔

دکن کی خود مختار حکومتوں کے زوال کے بعد عبرت ناک حالات کی بنا پر جب عوام نے مذہب و تصوف کے دامن میں پناہ لی تو ایک بار پھر مثنوی میں مذہبی اور صوفیانہ عقائد پیش کرنے کے رجحان نے فروغ حاصل کیا چنانچہ اس دور میں کئی بہترین صوفیانہ مثنویاں وجود میں آئیں ان میں ذوقیؔ کی ''وصال العاشقین''، جس میں ''سب رس'' کا قصہ نظم کیا گیا ہے، عشرت کی ''چت لگن اور دیپک پتنگ''، وجدیؔ کی ''پنچھی باچھا، باغ جان افزا، اور تحفۂ عاشقاں''، بحریؔ کی ''من لگن''، ولی ویلوریؔ کی ''روضہ الشہداء''، اشرفؔ کی ''جنگ نامہ حیدر'' اور محمودؔ کی ''قصہ ملکۂ مصر'' اہم مثنویات ہیں۔

اس دَور میں مذہبی مثنویوں کے علاوہ چند ایسی مثنویاں بھی ملتی ہیں جن میں عشق و محبت کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس سلسلے میں عاجزؔ کی قصۂ لعل و گوہر، آگاہؔ کی گلزارِ عشق، امینؔ کی یوسف زلیخا اور سراجؔ کی بوستانِ خیال ایسی مثنویات ہیں جن میں واردات عشق پر زور دیا گیا ہے۔ ان میں ''بوستانِ خیال'' غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اس مثنوی میں مناظر کے مصوّرانہ بیانات، سیرت نگاری کی مہارت، جذباتِ انسانی کی مؤثر تصویر کشی اور فنّی کمالات کے ساتھ اُسلوب بیان کی جدت، زبان و بیان کی سادگی، سلاست، تسلسل، روانی اور شگفتگی وغیرہ خوبیوں نے اس مثنوی کو دکن کی بلند پایہ مثنوی کا درجہ عطا کر دیا ہے۔

03.06 دکنی مثنویات کا جائزہ

دکن میں اردو مثنوی کے آغاز اور ارتقا کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ شعرائے دکن نے جہاں ایک طرف صنف مثنوی سے غیر معمولی دل چسپی لی وہیں اپنی فکری و فنّی صلاحیتوں سے اردو مثنوی نگاری کو اِرتقا کی مختلف منزلوں سے ہم کنار کیا۔جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا کہ مثنوی کے ابتدائی دَور میں مثنوی پر مذہب کا رنگ غالب تھا۔اِبتدا میں جو مثنویاں کہی گئیں وہ مختصر اور موضوعاتی تھیں۔صوفیائے کرام نے قدیم اردو کو اور مثنوی کی صنف کو خاص مقصد کے تحت تبلیغ واشاعت کے مؤثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا اسی لئے ابتدائی دَور کی مثنوی میں مقصدیت کا عنصر نمایاں ہے۔اس دَور کی مثنویات عموماً بیانیہ نہیں ہیں۔جب زبان میں بیانیہ کی قوّت پیدا ہوئی اور اس کے الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ ہوا تو طویل مثنویاں وجود میں آئیں جن میں ادبیت بھی موجود تھی۔

خوب محمد چشتی کی مثنوی ''خوب ترنگ'' ایک ایسی ہی مثنوی ہے جس میں وحدت، حقائق، موجودات ظہور عین عالم اور ذات مطلق جیسے دقیق موضوعات سے بحث کی گئی ہے لیکن بیش تر مسائل کو تمثیلی پیرایہ میں بیان کر کے اس میں قاری کے لئے دل چسپی پیدا کر دی ہے اسی طرح میراں جی شمس العشاق میں خوش یا خوشنودی نامی لڑکی کا قصہ بیان کر کے مذہبی زندگی کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ دکن میں مثنویات پر مذہبی رنگ اگر چہ بعد میں بھی رہا لیکن خودمختار سلطنتوں کے قیام کے بعد ادبی مثنویات کو فروغ حاصل ہوا۔ دکن میں غیر مذہبی موضوع پر لکھی جانے والی پہلی بیانیہ مثنوی نظامی کی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے۔

کدم راؤ پدم راؤ'' کے بعد دوسری بیانیہ مثنوی اشرف کی ''نوسر ہار'' ہے۔ دکن میں مثنوی میں ادبی رنگ کی جلوہ گری خودمختار سلطنتوں کے قیام کے بعد نظر آتی ہے اس سلسلہ میں بیجاپور کے ابتدائی دَور کے شاعر عبدل کی مثنوی ''ابراہیم نامہ'' ہے یہ مثنوی عبدل نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی فرمائش پر نظم کی تھی۔ ''ابراہیم نامہ'' میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے تاریخی حالات اور معاشرتی زندگی کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے اور ابراہیم شاہ کی شخصیت کی متنوّع خصوصیات کے بیان کے ساتھ اس کے طرزِ حکومت، انتظام و انصرام اور دوسرے معاملات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مثنوی میں عبدل نے ایسی زبان اور ایسا پیرایہ بیان اختیار کیا ہے جس کے نمونے اس دَور میں موجود نہیں تھے۔ ہیئت کے اعتبار سے بھی عبدل نے فنّی اصولوں کی پابندی کی ہے۔ مثنوی میں جا بجا دل کش تشبیہات اور نادر استعارات کے استعمال سے عبدل کے زورِ تخیل اور قدرت بیان کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ مثنوی دکنی مثنویات میں ایک نئے موڑ کا پتہ دیتی ہے۔ اس دَور میں مقیمی کی مثنوی ''چندر بدن و مہیار'' اس لحاظ سے اہم مثنوی ہے کہ اس میں عشقیہ قصہ بیان کیا گیا ہے اور عرب کے لیلیٰ مجنوں، ایران کے شیریں فرہاد اور پنجاب کے ہیر رانجھا کی طرح دکن کے مہیار اور چندر بدن کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے مثنوی قصہ گوئی میں مہارت اور المیہ انجام کی بنا پر خاص اہمیت رکھتی ہے شمالی ہند کے بعض مثنوی نگار شعرا مثلاً میر، راسخ اور مصحفی نے یہی رنگ اختیار کیا۔ عبدالقادر سروری نے ''اردو مثنوی کے ارتقا'' میں ''چندر بدن و مہیار'' کو کلاسیکی ادب پارے کا درجہ عطا کر کے اس کی قدر و قیمت کا اعتراف کیا ہے۔

صنعتی کی مثنوی ''قصۂ بےنظیر'' اپنے ڈرامائی انداز کی بنا پر انفرادیت کی حامل ہے اس مثنوی میں کئی ڈرامائی موڑ آتے ہیں جنہیں مثنوی نگار نے بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے مثنوی میں بزم کے بیانات کے ساتھ رزمیہ مناظر کے موثر اظہار نے اس مثنوی کی اہمیت میں بڑا اضافہ کر دیا ہے۔ صنعتی کے زورِ بیان، جزئیات نگاری کی سلیقہ مندی، قوت اظہار، روانی و بے ساختگی اور طرزِ ادا کی خوبیوں اور لسانی خصوصیات کے لحاظ سے یہ مثنوی دکنی مثنویات میں امتیازی مقام کی حامل ہے۔ صنعتی کی دوسری مثنوی ''گلدستہ'' میں عشقیہ داستان بیان کی گئی ہے۔ اس مثنوی کی زبان کی سلاست اور بیان کی دل کشی کے ساتھ مثنوی میں تبلیغ اور تلقین کے اجزاء نے مثنوی کو منفرد درجہ عطا کر دیا ہے۔ عشقیہ واقعات کی دل چسپی اور دل نشینی میں نصیحت اور سبق آموز باتوں کا ایسا امتزاج دکن کی مثنویوں میں کم ہی نظر آتا ہے۔

ملک خوشنود کی مثنوی ''جنت سنگھار'' جس میں بہرام گور کی داستان بیان کی گئی ہے۔ قصہ در قصہ کی ٹیکنک کے لحاظ سے انفرادی مقام رکھتی ہے۔ رستمی کی ''خاور نامہ'' دکن کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ ''خاور نامہ'' میں اگر چہ حضرت علی کی داستان بیان کی گئی ہے لیکن شاعر نے اسلامی تاریخ سے زیادہ اپنے تخیل اور داستان گوئی میں اپنی مہارت سے کام لے کر اسے ایک کامیاب رزمیہ کا درجہ عطا کر دیا ہے۔ ''خاور نامہ'' میں فارسی مثنویات کے اثرات نمایاں ہیں اور پوری مثنوی پر عجمی فضا طاری ہے۔

دراصل اس دور میں دکن میں فارسی مثنویوں سے خوشہ چینی کا رجحان عام ہوگیا تھا جو تاریخ کا فطری عمل تھا اس دور میں فارسی مثنویوں کو دکنی میں منتقل کیا جارہا تھا اور فارسی اسالیب، وسائلِ ترسیل اور فارسی بحور واوزان اختیار کیے جارہے تھے تلمیحات، تشبیہات اور استعارات وغیرہ میں مقامی رنگ کی جگہ آہستہ آہستہ ایرانی اثرات جگہ پارہے تھے چنانچہ رستمی نے جہاں فارسی کارنامے ''خاور نامہ'' کو پیش نظر رکھ کر اپنی مثنوی لکھی وہیں فارسی طرز ادا، ابلاغ کے سانچوں، فارسی لفظیات، فارسی تراکیب کا استعمال کیا ہے اس کے علاوہ اس مثنوی میں اگر چہ اصل ہیرو حضرت علی کو بنایا گیا ہے لیکن ان کی معرکہ آرائیاں اور درمیان میں پیش آنے والے واقعات اور شہر صنم، شہر خاور، قلعہ صور، قلعۂ آہن، کوہ بلورہ اور حصار ظلمات وغیرہ اور جادوگر، دیو، پریاں سب عجمی اثرات کی نشان دہی کرتے ہیں اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ رستمی کا ''خاور نامہ'' دکن کی اردو مثنویات پر فارسی مثنویات کے گہرے اثرات کا سلسلہ شروع ہوا۔

رستمی کے خاور نامہ کے بعد فارسی کے اثرات کے تحت وجود میں آنے والی مثنویوں میں نصرتی کی مثنویاں ''علی نامہ، گلشنِ عشق'' اور ''اسکندر نامہ'' ہیں۔ ''علی نامہ'' ایک طویل رزمیہ ہے تو ''گلشنِ عشق'' بزمیہ اور ''اسکندر نامہ'' بیجاپور کے دور انتشار کی تاریخ ہے۔ ''گلشنِ عشق'' میں اگر چہ مدمالتی اور منوہر کی داستان عشق بیان کی گئی ہے لیکن اس کا پلاٹ دورِ قدیم کے داستانی ادب کے اجزا کے امتزاج سے تیار کیا گیا ہے۔ مثلاً ہیرو کا مصائب میں مبتلا ہونا پھر مافوق الفطرت طاقتوں سے مقابلہ کرنا اور کسی بزرگ کی رہبری سے منزل مقصود تک پہنچنا اس کی مثال ہیں۔ ''گلشنِ عشق'' میں قصہ کی پیش کش، تسلسل بیان، کردار نگاری، سراپا نگاری، جذبات کی عکاسی اور مظاہر قدرت کی عکاسی میں نصرتی نے غیر معمولی فن کاری کا ثبوت دیا ہے اور دکنی اور فارسی مثنویات کے مختلف صحت مند عناصر سے اردو مثنوی نگاری کو نیا اسلوب اور معیار عطا کر دیا ہے نصرتی کی مثنوی ''علی نامہ'' بھی دکنی مثنویات میں ایک خاص معیار قائم کرنے کا باعث ہے۔ اس میں نصرتی نے علی عادل شاہ کی جنگوں کا بیان کیا ہے اور اس کی مدح وستائش کی ہے علی نامہ کی بڑی خوبی تاریخی واقعات کی صداقت ہے اس مثنوی میں نصرتی نے عادل شاہ کے حالاتِ زندگی، اس کی تخت نشینی، درباری زندگی، انجمن آرائی، جشن اور تقریب وغیرہ کا بیان تاریخی تسلسل کے ساتھ کیا ہے جس کی وجہ سے اس مثنوی کو سوانحی مثنوی کا درجہ حاصل ہوگیا ہے جیسا کہ پہلے تذکرہ کیا گیا ہے مثنوی میں نصرتی نے جابجا اپنی غیر معمولی فن کارانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے اس کے علاوہ اس میں اس کا لب ولہجہ بلند آہنگ اور طرزِ ادا پرشکوہ ہے جس سے مثنوی میں قصیدہ کی سی شان پیدا ہوگئی ہے۔ نصرتی کی مثنوی ''اسکندر نامہ، علی نامہ'' کے مقابلے میں مختصر بھی ہے اور اس میں وہ شاعرانہ کمال بھی نظر نہیں آتا جو ''علی نامہ'' میں جابجا موجود ہے بہرحال اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نصرتی کی مثنویات سے دکن میں مثنوی کا ایک بلند معیار قائم ہوا۔

بیجاپور کی عادل شاہی سلطنت کے زیر سایہ وجود میں آنے والے مثنویات کے ساتھ ہی گول کنڈہ کی قطب شاہی حکومت کے دوران میں وجود میں آنے والی مثنویات اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا پر خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ دبستانِ گولکنڈہ کی پہلی ادبی کاوش شیخ احمد شریف گجراتی کی مثنوی ''یوسف زلیخا'' توضیحی شاعری کی بہترین مثال ہے اس میں مثنوی نگار نے عزیز مصر کے محل زلیخا کی خانقاہ، حضرت یوسف کے قصر، سات قطعات والے محل، دائی کے تیار کردہ باغ وغیرہ کی تصویر کشی میں اور مناظر فطرت کی عکاسی میں وسیع مشاہدہ، باریک بینی اور فن کارانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ مثنوی میں احمد نے یوسف اور زلیخا کے جو سراپے پیش کیے ہیں اور لباس وزیورات وغیرہ کی جو تصاویر پیش کی ہیں وہ بے مثال ہیں اس کے علاوہ یہ مثنوی رنگینیِ کلام، اچھوتی تشبیہات، نادر استعارات، زورِ تخیل اور دوسرے شعری محاسن کے لحاظ سے امتیازی مقام رکھتی ہے۔

گول کنڈہ کی دوسری مثنویات ''قطب مشتری'' اور ''سیف الملوک وبدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' اور ابن نشاطی کی ''پھول بن'' وغیرہ کا تذکرہ کیا جاچکا ہے۔اس جائزہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ جیسے جیسے حالات بدلے مثنویات میں فارسی کے اثرات اور فنّی لوازمات میں اضافہ ہوااور پلاٹ کی ترتیب، واقعات کے بیان میں ربط وتسلسل کے ساتھ اپنے دور کے حالات کا اظہار، طرزِ زندگی کے مختلف معاملات کی عکاسی، تہذیب ومعاشرت کی تصویر کشی، رسم ورواج اور عقائد کی ترجمانی مناظر فطرت کی عکاسی وغیرہ میں مثنوی نگار شعرا نے اپنے وسیع تجربات، گہرے مشاہدات، باریک بینی اور فن کاری کا ثبوت دے کر اس صنف کے دامن کو وسیع تر کیا اور زبان وبیان کی خصوصیات کے ساتھ تشبیہات کی جدت، استعارات کی ندرت، موقع محل کے لحاظ سے دل کش تراکیب کے استعمال، اور تلمیحات، ضرب الامثال، روزمرہ محاورات اور صنعتوں کے فن کارانہ استعمال سے مثنوی نگاری کا ایک بلند معیار قائم کردیا۔

03.07 دکن میں اردو مثنوی کی مقبولیت کم ہونے کے اسباب

دکن کی خودمختار حکومتوں کے زوال کے بعد چوں کہ دکن میں شعروادب کی محفلیں ویران ہوگئیں اور شعرا کی سرپرستی کرنے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنے والے افراد نہ رہے۔اس کے علاوہ اس دَور میں شمالی ہند میں شعروادب کی محفلیں آراستہ ہوئیں۔ ولّی کے دیوان کے اثرات نے فارسی میں شعر گوئی کرنے والے شعرا کو اردو شاعری کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ شمالی ہند کے شعرا نے غزل گوئی کے ساتھ مثنوی نگاری میں بھی طبع آزمائی کی جس کی وجہ سے دکن میں مثنوی نگاری سے دل چسپی کم ہوگئی۔اور آخری دَور کی مثنوی ''بوستانِ خیال'' کے بعد کوئی بڑا کارنامہ سامنے نہیں آسکا۔

03.08 خلاصہ

دکن میں اردو شاعری کے اِرتقا کا زمانہ اردو مثنوی کے اِرتقا کا عہد ہے۔ دکن میں اردو مثنوی کا باقاعدہ آغاز نظامی کی مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے ہوتا ہے۔دکن میں اردو شاعری کی اِبتدا صوفیوں اور درویشوں کے زیرسایہ ہوئی تھی اس لئے ابتدائی دور کی مثنویاں معرفت، سلوک، پندوموعظت اور مذہبی عقائد پر مشتمل ہیں۔ان میں اشرف کی ''نوسرہار''، فیروز بیدری کی ''پرت نامہ''، شاہ میراں جی شمس العشاق اور ان کے فرزند شاہ برہان الدین جانم کی مختصر مثنویاں ''خوش نامہ، خوش نغز، شہادت الحقیقت، ارشاد نامہ، در بیان نصیحت گوید، نسیم الکلام'' اور شیخ محمد چشتی کی طویل مثنوی ''خوب ترنگ'' شامل ہیں۔

ابتدائی دور کے مثنوی نگار چوں کہ صوفی اور درویش تھے۔شاعری ان کے لئے رشد وہدایت کا وسیلہ تھی۔ادب کی خدمت ان کا مقصد نہیں تھا اس لئے اس دَور کی مثنویات میں ادبی حسن نہیں ملتا۔مثنوی نگاری میں ادبی دل کشی اور فن کاری کے نمونے دکن میں بہمنی حکومت کے زوال کے بعد خودمختار سلطنتوں کے قیام کے بعد سے ملنے شروع ہوتے ہیں۔خودمختار سلطنتوں کے اکثر سلاطین شاعر تھے اور بیش تر علم وادب سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ عادل شاہی دورِحکومت اور قطب شاہی دور حکومت میں شعروادب کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور مثنوی میں عشق ومحبت کی داستانیں بیان کرکے اپنے زور بیان، قدرت کلام اور شعری مہارت کا ثبوت دیا جانے لگا جس کی بنا پر مثنوی کو غیر معمولی مقبولیت اور اہمیت حاصل ہوئی۔ دکن میں درباری شاعر وجہی نے مثنوی ''قطبِ مشتری'' لکھی جس میں بادشاہ کو مہم کا ہیرو بنا کر پیش کیا۔ وجہی کے بعد دکن میں ادبی مثنویوں کا ایک طویل اور شان دار سلسلہ نظر آتا ہے۔

اس تمام دَور میں چند مثنویات کو چھوڑ کر بیش تر رومانی داستانوں پر مبنی ہیں۔ان میں احمدؔ کی مثنوی ''لیلیٰ مجنوں''، غواصیؔ کی ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ''، مقیمیؔ کی ''چندر بدن ومہیار''، امینؔ کی ''بہرام وحسن بانو'' ملک خوشنودؔ کی ''ہشت بہشت''، ابن نشاطیؔ کی ''پھول بن''، نصرتیؔ کی ''گلشنِ عشق''، جنیدی کی ''ماہ پیکر''، طبعیؔ کی ''بہرام وگل اندام'' اور ہاشمی کی ''یوسف زلیخا'' خاص ہیں۔ان مثنویات میں اگر ایک طرف ایسی مثنویات ہیں جن میں فوق الفطرت داستانیں بیان کی گئیں ہیں تو دوسری طرف ایسی مثنویات ہیں جن میں قصہ گوئی سے زیادہ جذبات نگاری پر زور دیا گیا ہے۔

''لیلیٰ مجنوں، چندر بدن ومہیار'' اور ''یوسف زلیخا'' ایسی ہی مثنویاں ہیں۔اسی زمانہ میں چند ایسی مثنویات وجود میں آئیں جن میں رزمیہ نگاری کے جوہر دکھائے گیے۔نصرتیؔ کی مثنوی ''علی نامہ'' میں عادل شاہ کے معرکوں کا بیان کیا گیا ہے جب کہ رستمیؔ کی ''خاور نامہ'' میں حضرت علی کے مہمات اور معرکوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔یہ مثنوی ۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔یہ ابن حسام کی فارسی مثنوی کا ترجمہ ہے۔ دکن میں خودمختار حکومتوں کے زوال کے بعد جب حالات ابتر ہوئے تو ایک بار پھر شعرا تصوف اور مذہب کی طرف مائل ہونے لگے۔چنانچہ اس زمانے میں چند بہترین صوفیانہ مثنویات وجود میں آئیں جن میں ذوقیؔ کی ''وصال العاشقین''، عشرتؔ کی ''چت لگن'' اور ''دیپک پتنگ''، وجدیؔ کی ''پنچھی باچھا، باغ جانفزا'' اور ''تحفۂ عاشقاں'' اور بحریؔ کی ''من لگن'' خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس زمانہ میں چند ایسی مثنویاں بھی لکھی گئیں جن میں عشق ومحبت کے واقعات بیان کیے گیے۔اس ضمن میں عاجزؔ کی قصہ لعل وگوہر، غلام قادری سامیؔ کی مثنوی سروشمشاد، آگاہؔ کی مثنوی گلزار عشق، امینؔ کی یوسف زلیخا اور سراجؔ کی بوستانِ خیال غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔دکن میں اردو مثنوی کے ارتقا کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرزمین دکن میں اردو مثنوی نے اپنے اِرتقا کا طویل زمانہ طے کیا اسی کے ساتھ یہاں کے شعرا نے اپنی علمی معلومات اور فنّی صلاحیت کے استعمال سے اردو مثنوی کے دامن کو نہ صرف وسیع کیا بلکہ اس کے ادبی وقار میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا۔داستانی واقعات کے بیان کے دوران میں مثنوی نگار شعرا نے اپنے عہد کی زندگی، معاشرت تہذیب وتمدن اپنے اطراف کے واقعات، جغرافیائی حالات، فطری مناظر سے رنگ بھرا جس کی بنا پر یہ تمام مثنویاں اپنے زمانہ تخلیق کی طرزِ زندگی، طرزِ معاشرت، تہذیبی وتمدنی حالات، رسم ورواج، نظریات وعقائد کی عکاس ہیں اس کے علاوہ مثنوی نگار شعرا نے مثنویات میں واقعہ نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، سراپا نگاری، جذبات نگاری وغیرہ میں اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر کے اردو مثنوی کی قدر و قیمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا ہے۔

ذیل میں اس اکائی کی خصوصیات پیش کی گئی ہیں:

﴿۱﴾ اردو شعر وادب کے ابتدائی نمونے سرزمین دکن میں ملتے ہیں۔﴿۲﴾ صنف مثنوی فارسی کے زیر اثر اردو میں رائج ہوئی۔ ﴿۳﴾ اردو مثنوی کی باقاعدہ اِبتدا دکن میں ہوئی۔﴿۴﴾ اردو شاعری کا دکنی عہد مثنوی کا عہد ہے۔﴿۵﴾ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سلطان احمد شاہ بہمنی کے دور میں لکھی گئی تھی۔﴿۶﴾ شاہ میراں جی شمس العشاق کی مثنویات میں معرفت اور سلوک کے مسائل واضح کیے گیے ہیں۔ ﴿۷﴾ اشرف کی مثنوی ''نوسرہار'' نو ابواب پر مشتمل ہے۔﴿۸﴾ مثنوی ''پرت نامہ'' میں فیروزؔ نے اپنے روحانی رہبر مخدوم جی سے اپنی والہانہ عقیدت مندی اور جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔﴿۹﴾ دکنی مثنویات میں ادبیت اور شعری وفنی خوبیوں کی کارفرمائی کا زمانہ خودمختار حکومتوں کے قیام کے بعد شروع ہوتا ہے۔﴿۱۰﴾ مثنوی ''چندر بدن ومہیار'' مہیار نامی شخص اور ہندولڑکی چندر بدن کی داستان عشق پر مشتمل

ہے مثنوی کی مقبولیت کا اصل سبب قصہ کی دل چسپی اور بیان کی روانی و تسلسل میں مضمر ہے۔ ﴿۱۱﴾ مثنوی ''قصۂ بے نظیر'' داستانی انداز اور طلسماتی فضا کی پہلی اردو مثنوی ہے۔ ﴿۱۲﴾ رستمی کی مثنوی ''خاور نامہ'' ایک کامیاب رزمیہ مثنوی ہے۔ ﴿۱۳﴾ نصرتی کی مثنوی ''گلشنِ عشق'' میں منوہر اور مالتی کے عشق کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ ﴿۱۴﴾ مثنوی ''علی نامہ'' میں علی عادل شاہ کے سوانحی حالات بیان کیے گیے ہیں اور مغلوں اور شواجی سے عادل شاہ کی جنگوں کے مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔ ﴿۱۵﴾ ''قصص الانبیاء'' میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور اکرم ﷺ تک اکیس انبیاء علیہم السلام کے حالات بیان کیے گیے ہیں۔ ﴿۱۶﴾ دکن میں قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا جس نے ۹۲۴ھ میں خود مختار حکومت قائم کی تھی اور گول کنڈہ کو اپنا پایۂ تخت بنایا تھا۔ ﴿۱۷﴾ مثنوی ''قطب مشتری'' کا مصنف دکن کا اعلیٰ پایہ کا شاعر اور نثر نگار وجہی تھا۔ ﴿۱۸﴾ ''قطب مشتری'' اپنے زمانے کی تہذیب و معاشرت اور بیان کی سادگی، بے تکلفی، بے ساختگی، ربط و تسلسل اور فنّی خصوصیات کے لحاظ سے دکنی مثنویات میں انفرادیت کی حامل ہے۔ ﴿۱۹﴾ سیف الملوک و بدیع الجمال کا قصہ الف لیلہ سے ماخوذ ہے۔ ﴿۲۰﴾ مثنوی ''پھول بن'' کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی سترہ سو چوالیس: ۱۷۴۴/اشعار پر مشتمل ہے۔ ﴿۲۱﴾ ''پھول بن'' میں تین قصوں کے علاوہ تین تعارفی خاکے بھی شامل ہیں۔ ﴿۲۲﴾ مثنوی ''بہرام و گل اندازم'' طبعی کی مثنوی ہے۔ اس میں ایران کے بادشاہ گور کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کا پلاٹ بڑا مربوط ہے۔ اس کے علاوہ کردار نگاری، منظر نگاری، سراپا نگاری، جذبات نگاری، نازک خیالی، طرزِ ادا کی بے ساختگی و روانی اور زبان کی سادگی اثر انگیزی کے لحاظ سے یہ منفرد مقام رکھتی ہے۔ ﴿۲۳﴾ دکن کی خود مختار حکومتوں کے زوال کے بعد عبرت ناک حالات کی بنا پر جب عوام نے مذہب و تصوف کے دامن میں پناہ لی تو ایک دفعہ پھر مثنوی میں مذہبی اور صوفیانہ عقائد پیش کرنے کے رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔ ﴿۲۴﴾ دکن میں آخری زمانے میں جو مذہبی اور صوفیانہ عقائد پر مشتمل مثنویاں لکھی گئیں ان میں عشرتی کی چت لگن، وجدی کی پنچھی باچھا، باغ جاں افزا، تحفۂ عاشقاں، بحری کی من لگن، ولی ویلوری کی روضہ الشہدا، اشرف کی جنگ نامۂ حیدر اور محمود کی قصہ ملکۂ مصر اہم مثنویات ہیں۔ ﴿۲۵﴾ دکن کے آخری زمانے میں عشقیہ مثنویات میں سراج کی ''بوستانِ خیال'' غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اس مثنوی میں مناظر کے مصورانہ بیان، سیرت نگاری کی مہارت، جذبات انسانی کی موثر تصویر کشی اور فنّی کمالات کے ساتھ اسلوب بیان کی جدت، زبان و بیان کی سادگی و سلاست، روانی اور شگفتگی وغیرہ خوبیوں نے اس مثنوی کو دکن کی بلند پایہ مثنوی کا درجہ عطا کر دیا ہے۔

03.09 فرہنگ

آمیز	: ملا ہوا	طرزِ فکر	: فکر کا انداز
ابلاغ	: پہنچانا، بھیجنا	طریقت	: راستہ، باطن کی پاکیزگی کا راستہ
اجزاء	: جزو کی جمع، حصے، ٹکڑے	طلسماتی فضا	: جادوئی فضا
اسالیب	: طریقے، قاعدے	ظہور عین	: اظہار، جلوہ
اشاعت	: شائع کرنا، پھیلانا	عبرت ناک	: افسوس کے قابل
اصحاب	: صاحب کی جمع	عرفان	: پہچان، خدا شناسی

اکابرین : بزرگ لوگ

المیہ : غم ناک

امتزاج : ملانا

انتشار : گھبراہٹ، پریشانی

انجمن آرائی : محفل سجانا

انصرام : بندوبست، انتظام

ایڈٹ : ترتیب

بحور : شعر کے اوزان

بزم : مجلس، محفل

بسیط : پھیلا ہوا

بلیغ : مکمل، پورا خوش بیاں

پرشکوہ : شان وشوکت والا

تبدیل قالب : روپ بدلنا

تبلیغ : شرعی احکامت پہنچانا

ترجمان : شارح

ترسیل : ارسال، روانگی

تصادم : مقابلہ

تصوف : وہ علم جس کے ذریعے سے دل کی صفائی ہوتی ہے

تلقین : تعلیم دینا، سمجھانا

تلمیحات : کسی مشہور قصہ کا کلام میں اشارہ کرنا

تمثیلی : نظیر، مثال، مشابہت

توضیحی : تشریح کرنے والی

چابک دستی : چستی، تیزی

چربہ : ہو بہو نقل کرنا

عقائد : عقیدے کی جمع

علائم : اشارے

عنصر : اصل، بنیاد، اصل جزو

غلبہ : زور آوری، ترجیح

غماز : چغلی کھانا، اشارہ کرنا

قدروں : رتبہ، بڑائی

قیاس : اندازہ

کارنامہ : بڑا کام

کلاسیکی : بلند درجہ رکھنے والی

گام زَن : چلنا

لسانی : زبان، بولی

لقب : وہ نام جو کسی خاص وجہ سے پڑا ہو

لوک کہانیاں : نچلے طبقے کی کہانیاں

ماخوذ : لینا، حاصل کرنا

مافوق الفطرت : فطرت سے اوپر، حیرت ناک

مبلغین : تبلیغ کرنے والے

متنوع : گوناگوں، رنگارنگی

محاسن : خوبیاں

محاکات : کسی چیز یا حالت کی ہو بہو نقل کرنا

محیط : حاوی ہونا، چھا جانا

مراقبہ : غور وفکر کرنا

مربوط : بندھا ہوا، جڑا ہوا

مرقعے : تصویریں

مستعار : اُدھار

خوشہ چینی	: فائدہ اٹھانا	مضمر	: چھپا ہوا
خیروشر	: اچھائی، برائی نیکی وبدی	معرفت	: پہچان، شناخت، علم الٰہی، خداشناسی
دستیاب	: میسر، حاصل	معرکہ آرائی	: جنگ
ذاتِ مطلق	: خداتعالیٰ	معنویت	: گہرائی
ذخیرہ	: خزانہ	معیار	: کسوٹی، پیمانہ
راست بازی	: ایمان داری، سچائی	مکالماتی انداز	: بات چیت کا انداز
رزمیہ	: جنگی داستان	منسوب	: متعلق، نسبت کیا ہوا
رشدوہدایت	: سچائی کا راستہ	منقبت	: تعریف، بزرگان دین کی تعریف
رقابت	: دشمنی	موجدات	: وہ کل چیزیں خداتعالیٰ نے پیدا کی ہیں
زوال	: کمی، اُتار، گھٹنا	موضوعاتی	: وضع کی ہوئی، کسی موضوع سے متعلق
سرگزشت	: واقعہ	مہماتی	: لڑائی، جنگ، بڑے اور خطرناک کام
شجاعت	: بہادری	والہانہ	: عاشق کی طرح
شریعت	: دینی قانون	وحدت	: یکتائی، ایک ہونا
شستہ	: پاک صاف	ہم شبیہ	: ہم شکل
صنعتوں	: کاری گری، شاعری میں کاری گری	ہمکنار	: ملنا
ضامن	: ضمانت دینے والا	ہیئت	: ساخت، بناوٹ

03.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ مثنوی ''چندر بدن ومہیار'' پر مختصر نوٹ لکھیے۔

سوال نمبر۲ رستمی کی مثنوی کو رزمیہ مثنوی کیوں کہا گیا ہے بتلائیے۔

سوال نمبر۳ نصرتی کی مثنوی ''علی نامہ'' کی خصوصیات پر اظہارِ خیال کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ قطب شاہی دور کی اہم مثنویات پر تبصرہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ دکن میں اردو مثنوی کے آغاز وارتقا کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کی ادبی اور فنّی خصوصیات کی وضاحت کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : دکن کی پہلی مثنوی کون سی ہے؟

(الف) نغز مرغوب (ب) ہشت بہشت (ج) کدم راؤ پدم راؤ (د) قصۂ بے نظیر

سوال نمبر۲ : مثنوی ''قصص الانبیا'' کا مصنف ہے۔

(الف) نصرتیؔ (ب) قدرتیؔ (ج) عاجزؔ (د) احمدؔ

سوال نمبر۳ : ''قطب مشتری'' کب لکھی گئی؟

(الف) ۱۰۸۱ھ (ب) ۱۰۶۵ھ (ج) ۱۰۹۹ھ (د) ۱۰۱۸ھ

سوال نمبر۴ : ہاشمیؔ کی مثنوی ''یوسف وزلیخا'' میں کتنے اشعار ہیں؟

(الف) ۱۰۰۰ (ب) ۵۱۰۰ (ج) ۳۲۵۵ (د) ۵۰۲۵

سوال نمبر۵ : مثنوی ''ارشادنامہ'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(الف) شاہ برہان الدین جانم (ب) قطب الدین قادری (ج) اشرف (د) میراں جی شمس العشاق

سوال نمبر۶ : ''قوافی'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) قافلہ (ب) قفو (ج) قاف (د) قافیہ

سوال نمبر۷ : مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' کا تعلق کہاں سے ہے؟

(الف) دکن (ب) لکھنؤ (ج) دہلی (د) عظیم آباد

سوال نمبر۸ : ''قطب مشتری'' کس شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) شیرازیؔ (ب) ملا وجہیؔ (ج) نظامیؔ (د) عرفیؔ

سوال نمبر۹ : قطب شاہی سلطنت کا بانی کون تھا؟

(الف) محمد قطب شاہ (ب) محمد شاہ (ج) سلطان قلی قطب شاہ (د) قطب شاہ

سوال نمبر۱۰ : ''خودمختار'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) آزاد (ب) قیدی (ج) کمزور (د) ظالم

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ج) کدم راؤ پدم راؤ

جواب نمبر۲ : (ب) قدرتیؔ

جواب نمبر۳ : (د) ۱۰۱۸ھ

جواب نمبر۴ : (ب) ۵۱۰۰

جواب نمبر۵ : (الف) شاہ برہان الدین جانم

جواب نمبر۶ : (د) قافیہ

جواب نمبر۷ : (الف) دکن

جواب نمبر۸ : (ب) ملا وجہی

جواب نمبر۹ : (ج) سلطان قلی قطب شاہ

جواب نمبر۱۰ : (الف) آزاد

03.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد اوّل	از	پروفیسر سیدہ جعفر۔ پروفیسر گیان چند جین
۲۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں	از	ڈاکٹر گیان چند جین
۳۔ دکن میں اردو	از	نصیر الدین ہاشمی
۴۔ دکنی ادب کی تاریخ	از	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
۵۔ اردو شہ پارے	از	ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
۶۔ اردو مثنوی کا اِرتقا	از	عبدالقادر سروریؔ

اکائی 04 شمالی ہند کی مثنویات کا جائزہ

ساخت

04.01 : اغراض ومقاصد

04.02 : تمہید

04.03 : شمالی ہند کے ابتدائی دَور کی مثنویات کا جائزہ

04.04 : شمالی ہند میں دبستانِ دہلی کی مثنویات کا جائزہ

04.05 : شمالی ہند میں دبستانِ لکھنؤ کی مثنویات کا جائزہ

04.06 : قدیم رنگ کی مثنویات کا آخری دَور

04.07 : خلاصہ

04.08 : فرہنگ

04.09 : سوالات

04.10 : حوالہ جاتی کتب

04.01 اغراض ومقاصد

اُردو میں مثنوی نے اپنے ارتقائی سفر کے دوران میں کئی منازل طے کیے ہیں اور تاریخ، تہذیب، معاشرت کے مختلف معاملات اور مختلف مقامات کے حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ یہ صنف بھی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوئی ہے مثلاً ابتدا میں مذہبی ماحول کی بنا پر مثنوی میں مذہبی معاملات پر زیادہ توجہ دی گئی تو دکن میں خودمختار سلطنتوں کے قیام کے بعد کے حالات میں اس زمانے کی دل چسپیوں کا لحاظ رکھا گیا چنانچہ دکن میں مثنوی نگاری کا رجحان کم ہونے کے بعد جب شمالی ہند میں مثنوی نے مقبولیت حاصل کی تو یہاں کے حالات اور ماحول سے اثرات قبول کیے۔ اس اکائی میں انہیں باتوں کا لحاظ رکھ کر ان کا جائزہ لیا جائے گا تا کہ شمالی ہند میں لکھی جانے والی مثنویات کی امتیازی خصوصیات کا اندازہ ہو سکے اور شمالی ہند میں اردو مثنوی نے اِرتقا کی جو نئی منزلیں طے کیں اس سے واقفیت حاصل ہو سکے۔

نیز مثنوی نگاری میں فنی سطح پر اور زبان و بیان کے معیار کے سلسلہ میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کا اندازہ ہو سکے۔ اس اکائی کا ایک اور مقصد شمالی ہند میں اردو مثنوی کی تاریخ سے واقف کرانا بھی ہے تا کہ اردو میں مثنوی کی تاریخ کا پورا جائزہ سامنے آ سکے۔

04.02 تمہید

اُردو میں مثنوی کی صنف نے اپنے ارتقائی سفر کا آغاز سرزمین دکن سے کیا تھا۔ یہ زمانہ اردو شاعری کا بھی ابتدائی دور تھا اور جیسا کہ آپ کے علم میں ہے زبان بھی ابتدائی منزل میں تھی یعنی اس میں ادبیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اِبتدا میں مثنوی کے ذریعہ صوفیائے کرام نے

معرفت وسلوک کے معاملات سے عوام کو واقف کرانے کا کام کیا مثنوی میں ادبی رنگ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد شروع ہوا۔اس ادبی رنگ کو فروغ دینے میں دکن کی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کے حکمرانوں نے بڑا حصہ لیا جس کی وجہ سے شعرا نے مثنوی نگاری میں غیر معمولی دل چسپی لی اور کئی اہم مثنویاں وجود میں آئیں لیکن دکن میں خودمختار حکومتوں کے زوال کے بعد جب مغلیہ دورِ حکومت کا سلسلہ شروع ہوا تو یہاں شعروادب سے دل چسپی کم ہوگئی اور شعروادب کی محفلیں شمالی ہند میں آباد ہونے لگیں۔

شمالی ہند میں اگرچہ غزل کا بول بالا تھا لیکن شعرا نے دوسری اصناف شاعری کے ساتھ مثنوی میں بھی طبع آزمائی کی جس کی بنا پر شمالی ہند میں اردو میں بہترین مثنویاں تخلیق ہوئیں اور مثنویات کا ایک بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا۔شاعری چوں کہ اپنے ماحول کی پیداوار ہوتی ہے اور اپنے زمانے کی زندگی، معاشرت اور تہذیبی اقدار سے اثرات قبول کرتی ہے چنانچہ شمالی ہند کی مثنویات شمالی ہندوستان کے طرزِ فکر، طرزِ زندگی اور تہذیبی ومعاشرتی حالات کی عکاس ہیں۔اس کے علاوہ زبان وبیان کے لحاظ سے دکنی مثنویات کے مقابلے میں ایک الگ معیار کی حامل ہیں جس کا اندازہ شمالی ہند کی مثنویات کے جائزہ سے بخوبی ہوتا ہے۔

04.03 شمالی ہند کے ابتدائی دَور کی مثنویات کا جائزہ

شمالی ہند میں ابتدائی دور کی مثنویات شمالی ہند میں مثنوی نگاری کی ابتدا کے سلسلہ میں محققین کے درمیان اختلاف رائے ہے۔اب تک مثنویات کے جو نمونے دَست یاب ہوئے ہیں ان میں سب سے زیادہ مستند مثنوی افضل کی ''بکٹ کہانی'' ہے۔ یہ مثنوی تقریباً ۳۰۰ ر اشعار پر مشتمل ہے اور اس کا انداز ''بارہ ماسہ'' کا ہے۔''بارہ ماسہ'' اس نظم کو کہتے ہیں جس میں فراق زدہ بیوی ہر مہینے اپنے شوہر کو یاد کرتی ہے اور ہر مہینے کا موسم جذبات کے اظہار میں شدت پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔''بکٹ کہانی'' میں خالص ہندوستانی جذبات سامنے آتے ہیں اس کے علاوہ اس میں ہندوستان کی سرزمین کی خصوصیات، یہاں کے موسموں کا ذکر، موسمی پرندوں کا ذکر اور ہندوستانی رسم ورواج کے بیانات نے اس مثنوی کی ساری فضا کو ہندوستانی رنگ میں رنگ دیا ہے اس میں جزئیات کے بیانات اور جذبات کے اظہار میں شاعر نے بڑی فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔''بکٹ کہانی'' میں نہ تو کوئی پلاٹ ہے نہ کردار صرف ایک عورت کے جذبات پیش کیے ہیں۔اور عشق کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔مثنوی کی زبان قدیم اردو ہے۔فارسی کا گہرا اثر ہے کہیں کہیں آدھا مصرعہ اردو کا اور آدھا فارسی کا ہے۔

ابتدائی دور کی ایک مثنوی شیخ عبداللہ امیںؔ کی ''فقہ ہندی'' میں فقہ کے مسائل بیان کیے گیے ہیں۔اس دور کی دوسری مثنویات میں محبوب عالم شیخ جیونؔ کی مثنویات ۱:محشر نامہ،۲:دردنامہ،۳:خواب نامہ پیغمبر،۴: دھیر نامہ بی بی فاطمہ ہیں۔شمالی ہند میں اردو شاعری کی اِبتدا چوں کہ دہلوی شعرا نے کی چنانچہ اردو مثنوی نگاری کو فروغ سرزمین دہلی میں حاصل ہوا۔دہلی میں ابتدائی دور کے وہ شعرا جنھوں نے غزل گوئی کے ساتھ مثنویاں بھی کہیں ان میں میر جعفر زٹلی، فائز دہلویؔ، شاہ مبارک آبروؔ، شاہ حاتمؔ اور فضائل علی خاصؔ قابلِ ذکر ہیں۔میر جعفر زٹلی کے کلیات میں کئی مثنویات ملتی ہیں ان کی مختصر مثنویات میں ''درصفت پیری''، ''طوطی نامہ''، صفتِ جلوس اور اعظم شاہ''، ''مرثیہ اورنگ زیب'' اور طویل مثنوی ''ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر بادشاہ غازی، اہم ہیں۔ان میں ''طوطی نامہ'' میں روح کو طوطی مان کر تمثیلی انداز میں جسم کے فانی ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور ''ظفر نامہ اورنگ زیب'' میں اورنگ زیب کے دکن کے معرکہ کا بیان ہے۔

فائز دہلوی کی مثنویات کی تعداد ڈاکٹر جین نے ۱۶ درج کی ہے۔ چند کے عنوانات درج ذیل ہیں:

مناجات، درمدح شاہ ولادت، تعریف پنگھٹ، تعریف ہولی، تعریف جوگن، در وصف کاجھن، تعریف قبولن، مالن، گوجری فائزؔ کی مثنویوں میں مختلف کیفیات کا بیان کیا گیا ہے جس سے ان کی عاشق مزاجی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے یہاں بیان حسن میں مبالغہ آرائی اور تخیل پسندی کے بجائے سادگی ملتی ہے۔ احساسات اور جذبات کے بیان میں بھی شدت کے بجائے فطری کیفیت نمایاں ہے۔ فائز کی مثنویات میں حسن وعشق کے بیانات میں ان کے ذاتی تجربات اور وسیع مشاہدہ نے بڑی اثر انگیزی پیدا کر دی ہے انہوں نے سیدھی سادی شیریں زبان میں اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا ہے۔ شاہ مبارک آبروؔ کی مثنوی جس کے ۹۹/اشعار دَست یاب ہوئے ہیں اس کا کوئی عنوان نہیں ہے اس میں معشوق کو آرائش حسن کے لیے مشورے دیے گیے ہیں۔

شاہ حاتمؔ کے دیوان زادہ میں ۵/مثنویاں ملتی ہیں: ۱: مثنوی سراپا، ۲: ساقی نامہ، ۳: وصف قہوہ، ۴: وصف تمباکو در حقّہ، ۵: مثنوی بہاریہ۔ ابتدائی چار مثنویاں مختصر ہیں۔ ''مثنوی بہاریہ'' طویل مثنوی ہے جس میں کئی ذیلی عنوانات ہیں۔ اس مثنوی میں حاتم نے اپنے اطراف کی زندگی اور تہواروں ومناظر کو موضوع بنایا ہے جس سے ان کے عہد کے حالات اور شوق ودل چسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثنوی کی زبان سادہ اور بیان بے تکلفانہ ہے۔ اس دور میں فضائل علی خاصؔ کی ایک مثنوی کا پتہ چلتا ہے پوری مثنوی دَست یاب نہیں ہے تذکروں سے جو اشعار ملے ہیں ان سے مثنوی نگار کی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

شمالی ہند میں اردو مثنوی کا یہ ابتدائی دور پُر آشوب دور تھا شعرا کی نظروں کے سامنے غم انگیز اور روح فرسا نظارے تھے۔ سارا ماحول ناامیدی، محرومی ومایوسیوں کی فضاؤں سے لبریز تھا چنانچہ ابتدائی دور میں کوئی ایسی مثنوی تخلیق نہیں ہوسکی جسے دکنی مثنویات کے معیار کا قرار دیا جاسکے جو مثنویاں لکھی گئیں ان میں عموماً انفرادی وشخصی احساسات اور تجربات پیش کیے گیے۔ شمالی ہند میں مثنوی نگاری کے اچھے معیاری نمونے سوداؔ اور میر تقی میرؔ کے زمانے سے سامنے آنا شروع ہوتے ہیں۔

04.04 شمالی ہند میں دبستانِ دہلی کی مثنویات کا جائزہ

سوداؔ نے مختلف موضوعات پر مثنویاں کہی ہیں ان کے یہاں پانچ مدحیہ بارہ ہجویہ مثنویاں ہیں تو ایک مثنوی ''در شکایت موسم گرما'' پر ایک مثنوی اخلاقی موضوع پر ''مثنوی در بارہ زن وشوہر'' ایک مثنوی عشقیہ موضوع پر ''قصہ پسر شیشہ گر'' دو مثنویاں ادبی تنقید پر: ۱: ''معانی بیت مولانا روم'' ۲: ''سبیل ہدایت'' اور دو مثنویاں مکتوبات: ۱: ''خط در شکایت'' و ''خط در اشتیاق'' کے عنوان سے ملتی ہے۔ سوداؔ نے مثنوی کو صرف حسن وعشق کے بیان یا داستان طرازی تک محدود نہیں رکھا بلکہ مختلف موضوعات پر مثنویاں کہہ کر اس کے دامن کو وسیع کیا۔

سوداؔ کے یہاں مثنویات کی تعداد سے ان کی مثنوی نگاری سے دل چسپی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن مثنوی نگاری میں ان کی فن کاری ان کی مدحیہ اور ہجویہ مثنویات میں سامنے آتی ہے۔ سوداؔ اپنے دور میں بڑے قصیدہ گو تھے، قصیدہ سے ان کی طبعی مناسبت ان کی مدحیہ مثنویات میں بھی جا بجا نظر آتی ہے۔ ان کی ہجویہ مثنویات میں سے چند شخصی مخاصمت کی بنا پر لکھی گئی ہیں، چند سیاسی نوعیت کی ہیں کچھ مثنویاں ایسی ہیں جن میں زمانے کی کجروی کی شکایت کی گئی ہے چند میں اپنے دور کے خراب حالات کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ سوداؔ کی عشقیہ مثنوی ''قصہ پسر شیشہ گر'' روایتی انداز کی مثنوی ہے۔ اس میں اِبتدا میں حمد، نعت، منقبت اور ساقی نامۂ بہاریہ ہے۔ مثنوی میں تقریباً پانچ سو شعر ہیں۔ مثنوی کے قصہ میں کئی قصے ہیں اس طرح یہ قصہ در قصہ مثنوی ہے۔ مثنوی کا قصہ مرد سے مرد کے عشق کی داستان پر مبنی ہے۔

مثنویوں میں سوداؔ کا اندازِ بیان شگفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ہے۔اپنی مثنویات میں انہوں نے اکثر ایسے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے جن کا استعمال آج اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔سوداؔ نے اپنے مداحی کے مزاج کو اپنی مثنویات پر حاوی رکھا ہے اور قصیدہ کی طرح مثنوی نگاری میں جدت پسندی کا ثبوت دیا ہے۔میر تقی میرؔ اس زمانے کے دوسرے بڑے مثنوی نگار ہیں۔میرؔ کی مثنویوں کی تعداد ۳۴ ر ہے۔میرؔ نے مختلف موضوعات پر مثنویاں لکھی ہیں۔

موضوع کے لحاظ سے ان کی مثنویوں کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔پہلی قسم میں واقعاتی جن میں کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ ان مثنویات پر مشتمل ہے جن میں ذاتی غم وغصہ کا اظہار کیا گیا ہے اور حالات کی ابتری کو نمایاں کیا گیا ہے۔تیسری قسم ہجویہ مثنویوں کی ہے۔چوتھی قسم میں وہ مثنویاں ہیں جن میں میرؔ نے ان کی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں اور پانچویں قسم میں عشق ومحبت کو موضوع بنایا گیا ہے اور عشق سے متعلق قصے بیان کیے گیے ہیں۔

میر تقی میرؔ کی مثنویات کی بڑی خوبی موضوعات کے لحاظ سے ان کی وسعت اور ہمہ گیری ہے ان کی مثنویات ان کی نجی زندگی کے بہت سے معاملات ان کی سوچ وفکر کی ترجمان ہونے کے علاوہ ان کے عہد کے کوائف کی آئینہ دار ہیں ان میں عشق ومحبت کے واقعات کا بیان بھی ہے،عشقیہ والمیہ جذبات واحساسات کی ترجمانی بھی،سماجی زندگی کی عکاسی بھی،سیاسی حالات کی تصویر کشی بھی،عہد کے معاشرتی،معاشی اور تہذیبی حالات کی نقش گری بھی،گھریلو معاملات کا ذکر بھی اور بیرونی زندگی کے معاملات کا بیان بھی اس کے علاوہ ان مثنویات سے میر کے زمانے کے رسم ورواج،طور طریقوں کا بھی پتہ چلتا ہے اور خود میرؔ کی ذاتی زندگی کے مختلف واقعات،حادثات،دکھ درد،قلبی کیفیات کا بیان بھی ملتا ہے ان تمام باتوں کی بنا پر میرؔ کی مثنویات میں بڑا تنوع پیدا ہوگیا ہے۔

میرؔ کی کل مثنویاں اگر چہ اہمیت کی حامل ہیں لیکن ان کی عشقیہ مثنویات:۱-:اعجازِ عشق،۲:شعلۂ عشق،۳:دریائے عشق،۴:جوشِ عشق، ۵:معاملاتِ عشق،۶:عشق افغان پسر،۷:مورنامہ (آتش) عشق خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔یہ تمام مثنویاں میرؔ کی فطرت اور مزاج کی آئینہ دار اور ان کے ماحول کی عکاس ہیں۔ان سب میں عشق کا ایک بلند اور مثالی تصور پیش کیا گیا ہے۔یہ تصوّر بھی نہ روایتی ہے نہ رسمی بلکہ فلسفیانہ اور روحانی ہے۔میرؔ عشق کے بارے میں ایک وسیع نقطۂ نظر رکھتے تھے۔مثلاً:

عشق ہی عشق ہے جدھر دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

ان کی مثنویات ان کے اسی نقطۂ نظر کی غمّاز ہیں جن میں انہوں نے تخیلی واقعات اور قصے بیان کر کے عشق کی اہمیت اور قدر و قیمت واضح کی ہے۔عشق کے سلسلہ میں بیان کیے گیے قصوں کے واقعات میں عشق کا ایک پاکیزہ تصوّر پیش کیا ہے اسی رعایت سے ان کی مثنویوں کے زیادہ تر کردار شریف،نیک اور معصوم ہیں اور عشق کی راہ میں ایثار وقربانیاں دیتے ہیں۔جذبات واحساسات کے بیان میں بھی جذبۂ صداقت پر مبنی معلوم ہوتے اور احساسات میں دردمندی اور سوز وگداز ملتا ہے۔میرؔ کی اکثر مثنویوں کے کرداروں کے جذبات واحساسات کے بیان سے احساس ہوتا ہے کہ تمام کیفیات خود میرؔ کے قلب وجگر سے پیدا ہوئی ہیں جس کی وجہ سے مثنویات میں بڑا تاثر پیدا ہوگیا ہے اور عشقیہ واقعات آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں۔میرؔ کی عشقیہ مثنویوں کا انجام المیہ ہے ان کے یہاں ہیرو وہیروئن دونوں موت کے سرد ہاتھوں میں وصل حاصل کرتے ہیں۔

عشقیہ مثنویوں کے علاوہ میرؔ کی دوسری مثنویات میں ہجویہ مثنویوں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ یہ تمام میرؔ کے مزاج، ان کے عہد اور ان کے زمانے کے سیاسی، سماجی و معاشی حالات کی عکاس ہیں۔ بعض ہجویہ مثنویات میں میرؔ نے شخصیات کو بھی ہجو کا نشانہ بنا کر ان پر نکتہ چینی کی ہے ان مثنویات سے میرؔ کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ مجموعی طور پر میرؔ کی مثنویات مضامین کے تنوع، موضوعات کی رنگا رنگی، خیالات کی وسعت، واقعات کی اثر انگیزی، عشق و محبت کے جذبات و محسوسات کی موثر تصویر کشی، سماجی زندگی کی عکاسی، سیاسی حالات کی نقش گری، معاشی خرابیوں کی آئینہ داری اور خانگی زندگی کے مختلف معاملات کی پیش کش کے لحاظ سے امتیازی درجہ رکھتی ہیں ان مثنویوں میں زبان و بیان کی سادگی اور گھلاوٹ اور لب و لہجہ کی دردمندی اور سوز و گداز نے ان میں بڑا تاثر پیدا کر دیا ہے۔

میرؔ کے بعد اس دَور کی ایک خاص مثنوی ''اسرارِ محبت'' ہے۔ یہ نواب محبت خاں محبتؔ نے ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۶ء میں لکھی تھی۔ مثنوی سرزمین پنجاب کے ایک مشہور عشقیہ افسانے پر مشتمل ہے مثنوی کا ہیرو پنوں اور ہیروئن سسّی ہے۔ مثنوی کی ابتدا محبت کے فلسفے سے ہوتی ہے اس کے بعد حمد و نعت کے اشعار ہیں جن میں محبت کو ہی موضوع بنایا گیا ہے اس کے بعد حضرت علی کی شان میں منقبت کے اشعار ہیں۔ مثنوی کا انجام المیہ ہے۔ محبت کے معاملات اور ہجر کی کیفیات کا بیان موثر ہے اس کے علاوہ واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری میں مثنوی نگار نے اپنی فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس دور کی دوسری اہم مثنویات میں جعفر علی خاں حسرتؔ کی مثنوی ''طوطی نامہ''، ''ساقی نامہ'' ہجو حکیم، قائم چاند پوری کی ''حیرت افزا''، ''جذب الفت'' اور میر اثرؔ کی مثنوی ''خواب و خیال'' شامل ہیں۔

ان میں حسرتؔ کی مثنوی ''طوطی نامہ'' داستانی مثنوی ہے یہ تقریباً سوا دو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک شہزادے طوطا رام اور بھیلوں کی شہزادی شکر پارہ کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ قصہ کو آگے بڑھانے کے لئے مختلف مہمات، سحر اور طلسم اور مافوق الفطرت کرداروں کا سہارا لیا گیا ہے۔ قصہ بہت پیچیدہ ہے لیکن مثنوی نگار نے مثنوی میں اپنے عہد کی تہذیبی مرقع کشی میں اور جلسے جلوسوں، جشن اور تقریبات کی تصویر کشی میں اپنی باریک بینی اور وسیع مشاہدہ کا ثبوت دیا ہے۔ منظر نگاری اور جذبات نگاری میں بھی شاعر کی فن کاری سامنے آتی ہے۔ مثنوی ہجو حکیم میں حسرتؔ نے اناڑی حکیموں کی پول کھولی ہے اور یونانی دواؤں سے اپنی واقفیت کا فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ مثنوی مختصر ہے اور ۴۷/اشعار پر مشتمل ہے۔ حسرتؔ کی تیسری مثنوی ''ساقی نامہ'' میں ۲۰۹/اشعار ہیں۔ مثنوی کی فضا رندانہ ہے لیکن جوش و مستی میں شدت کی کمی ہے اس میں خالق اور دنیا کا ذکر بادہ و ساغر کے تلامذہ میں ہونے سے اس میں دل چسپی پیدا ہو گئی ہے۔

''حیرت افزا'' قائم کی طویل مثنوی ہے جو ۴۸۷/اشعار پر مشتمل ہے اس کے علاوہ کلیات قائم کے مخطوطوں میں ۲۸/مثنویاں اور ملتی ہیں۔ قائم کی مثنویوں میں عموماً روایتی قصے بیان کیے گیے ہیں بعض مثنویات میں موسم کی کیفیات کا بیان کیا گیا ہے۔ قائم کی مثنویات کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کوئی خاص حسن نہیں ہے۔ مثنوی ''خواب و خیال'' کے مصنف میر اثرؔ ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے خیال میں یہ مثنوی ۱۱۹۵ھ اور ۱۱۹۹ھ کے درمیان کی تصنیف ہے۔ مثنوی خواب و خیال ۳ ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس میں کوئی قصہ نہیں ہے بلکہ ہجر و وصال، آرزوئے وصل، راز و نیاز، چھیڑ چھاڑ، عشق و عاشقی کی مختلف کیفیات اور واردات کا بیان ہے۔ مثنوی کی ابتدا و آخر میں معرفت کے معاملات بھی بیان کیے گیے ہیں۔ مثنوی میں معاملاتِ عشق اور کیفیاتِ قلب اور جذبات و احساسات کے بیانات میں بڑی بے ساختگی اور اثر انگیزی پیدا کر دی ہے اس کے علاہ زبان کی صفائی، سلاست، روانی اور بے تکلفی نے اس مثنوی کی اہمیت میں بڑا اضافہ کر دیا ہے۔

مثنوی ''خواب وخیال'' کے بعد اردو مثنوی کی تاریخ میں سب سے اہم نام میر حسؔن کا ہے۔ میرؔ کی کلیات میں مختصر اور طویل گیارہ مثنویات شامل ہیں لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت کا سبب ان کی مثنوی سحر البیان ہے جس کے بارے میں خود انہوں نے کہا ہے:

جوانی میں جب ہوگیا ہوں مَیں پیر تب ایسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں نہیں مثنوی ، ہے یہ سحرالبیاں

مثنوی ''سحر البیان'' ۱۱۹۹ھ کو مکمل ہوئی تھی۔ مثنوی کی ابتدا حمد، نعت، منقبت، تعریف اصحاب اور مناجات سے ہوتی ہے اس کے بعد بے نظیر اور بدرِ منیر کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ مثنوی کا پلاٹ طبع زاد ہے لیکن اس کے مختلف اجزا الف لیلہ اور فارسی کی مثنویوں اور فارسی داستانوں سے لیے گیے ہیں۔ مثنوی سحر البیان میں میر حسؔن نے واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، منظر نگاری، تہذیب و معاشرت کی عکاسی، کردار نگاری اور جذبات نگاری میں اپنے غیر معمولی مشاہدہ کی صلاحیت، باریک بینی، بے مثال تخیل آفرینی اور فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ مثنوی سحر البیان میں میر حسن کے زمانے کی تہذیب و معاشرت، رسم ورواج کے مرقعے جہاں اس کی قدر و قیمت کے ضامن ہیں وہیں مثنوی کی زبان جسے میر حسن نے ''سحر البیان'' قرار دیا ہے۔ اس مثنوی کی ادبی قدر و قیمت میں اضافہ کا سبب ہیں ایک ایسے دور میں جب کہ شاعری میں ایہام گوئی، صنعت گری اور پُر شکوہ اظہار بیان اور دقیق ومشکل الفاظ عام تھے۔ میر حسؔن نے سادہ آسان وعام فہم الفاظ اور سلیس رواں دواں انداز بیان میں شاعرانہ لوازمات کو پورا کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس کی بنا پر مثنوی ''سحر البیان'' دبستانِ دہلی کی مثنویات میں امتیازی درجہ رکھتی ہے۔ اسی دور کے دوسرے مثنوی نگاروں میں مصحؔفی، انؔشا، جرأت، راسخ عظیم آبادی، رنگین اور مومؔن ہیں۔

مصحؔفی کی کلیات میں بیس مثنویات ملتی ہے ان میں بحر المحبت، شعلہ شوق، جذبۂ عشق، گلزار شہادت زیادہ مشہور ہوئیں ان میں مثنوی ''بحر المحبت'' میر کی مثنوی ''دریائے عشق'' کی بازگشت ہے۔ دوسری مثنویوں میں بھی مصحفی نے عشق کو موضوع بنایا ہے۔ انؔشا کے یہاں کل آٹھ مثنویاں ہیں جو کہ مختصر ہیں اور ہجویہ بھی ان میں زنبور، کھٹمل، پشہ، مگس اور گیا چند سا ہوکار کی ہجو کی گئی ہے۔ جرأت کے یہاں ۳۱ر مثنویاں ملتی ہیں ان کی مثنوی ''بحر الفت'' ہجر کی تڑپ کے بیان پر مشتمل ہے اور در صفت سراپائے معشوق میں معشوق کا سراپا بیان کیا ہے۔ جرأت کی مثنوی ''نامۂ جرأت بنام معشوق پری طلعت'' خط ہے جو محبوب کو لکھا گیا ہے۔ اور ''کارستانِ الفت'' ۳۸۳ر اشعار پر مشتمل مثنوی ہے درمیان میں ہندی دوہے بھی ہیں اس مثنوی میں قصہ بہت کم ہے تقریباً پوری مثنوی میں ہجر کی کلفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جرأت کے یہاں عشق کے علاوہ دوسرے موضوعات پر بھی کئی مثنویاں ملتی ہیں۔

اس دور میں ایسی بہت سی مثنویاں ملتی ہیں جن میں قصہ شدتِ جذبات سے دبا ہوا ہے۔ میر کے بھانجے تجؔلی کی ''لیلیٰ مجنوں''، نگار دہلوی کی ''یوسف زلیخا''، نواب محبت خاں محبؔت کی ''اسرار محبت'' اسی ذیل میں آتی ہیں۔ ایسی مثنویاں جن میں جذبات ہی جذبات ہیں اور قصہ برائے نام ہے ان میں سب سے پہلے میر اثر کی طویل مثنوی ''خواب وخیال'' ہے تو بعد میں جرأت کی ''شعلۂ شوق'' اور ''کارستانِ اُلفت'' ہیں اس زمانے میں دو اہم عارفانہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ میر حسن نے جن کا ذکر کیا ہے اپنی مثنوی ''رموز العارفین'' میں فارسی کی صوفیانہ مثنویات سے استفادہ کیا ہے اور شکایت کے پردے میں معرفت واخلاقی باتوں کی تلقین کی ہے اور راسؔخ کی مثنوی ''نور الانظار'' میں بے ثباتی دنیا، منازل سلوک اور مذہبی عقائد بیان کیے گیے ہیں یہ مثنویاں زبان وبیان کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں۔

اس دور کے ایک اہم مثنوی نگار رنگین ہیں۔رنگین نے بہت سی مثنویاں کہی ہیں ڈاکٹر گیان چند جین نے ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' حصۂ اوّل میں رنگین کی ۴۳ر مثنویوں کی فہرست دی ہے۔ان کی مثنویات میں ''مثنوی دل پذیر'' جو ۲ر ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔یہ عشقیہ مثنوی ہے۔اس کی حکایت دل چسپ ہے اور زبان نہایت صاف ستھری ہے۔دبستانِ دہلی کی دوسری مثنویات میں مومن کی مثنویات کی تعداد آٹھ ہے ان کی مثنویوں کی ابتدا قصیدہ کے انداز میں ہوئی ہے۔یہ تمام مثنویاں ان کے عشق کی داستان پر مشتمل ہیں اس دور میں دبستانِ دہلی میں اگر چہ بہت سی مثنویاں لکھی گئیں لیکن میر اور میر حسن نے مثنوی کا جو معیار قائم کر دیا تھا بعد کے دہلوی شعرا کی مثنویات اس معیار پر نہیں پہنچ سکیں اسی زمانے میں اردو شاعری کا ایک نیا مرکز لکھنؤ قرار پایا اور لکھنؤ کے ماحول، وہاں کی معاشرتی زندگی اور تہذیبی حالات نے اردو شاعری کو نیا انداز، نیا رنگ عطا کیا جس کے اثرات مثنوی پر بھی مرتب ہوئے۔

04.05 شمالی ہند میں دبستانِ لکھنؤ کی مثنویات کا جائزہ

لکھنؤ کے عیش وعشرت کے رجحان اور رنگین مزاجی کی بنا پر یہاں زیادہ تر عشقیہ مثنویات لکھی گئیں اور عشقیہ واقعات ومعاملات کھل کر بیان کیے گیے۔عشقیہ جذبات کے اظہار میں بے باکی وعریانیت کو جگہ ملی اور نسوانیت نے غلبہ حاصل کیا اور لکھنوی ماحول اور وہاں کے تہذیبی حالات کے تحت عیش ونشاط کا رجحان عام ہوا اور نزاکت ونفاست اور رنگینی کو خاص اہمیت حاصل ہوئی۔مثنویات میں جو ماحول پیش کیا گیا یا جو فضا پیدا کی گئی اس میں شاہانِ اودھ کے تہذیبی ماحول اور اَودھ کے دربار کے آداب ورسومات کو ملحوظ رکھا گیا۔امامیہ حکومت اور ماحول کی وجہ سے مثنویوں میں جا بجا امام باڑوں، درگاہ حضرت عباس اور مجلسوں کا ذکر کیا گیا، بعض مثنویاں تو پوری کی پوری اماموں کے کرامات سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔لکھنوی مثنویات کی ایک اور بڑی خصوصیت زبان وبیان کی رنگینی، رعایت لفظی، ضلع جگت، صنائع بدائع کے استعمال کی کثرت اور مبالغہ آرائی کے علاوہ دل کش تشبیہات، نادر استعارات، دل نشیں تراکیب اور فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ کی مثنویات میں ناسخ کی مثنوی سراج نظم، نسیم کی گلزارِ نسیم، صبا لکھنوی کی شکار نامہ، واجد علی شاہ، واجد علی شاہ اختر کی حزنِ اختر، خاقانِ سرور، دریائے تعشق اور بحر الفت، نواب مرزا شوق کی زہر عشق، بہارِ عشق اور فریبِ عشق اور قلق کی مثنوی طلسمِ الفت قابلِ ذکر ہیں۔ناسخ کی مثنوی سراجِ نظم روایات واحادیث کے ترجمے پر مشتمل ہے۔مثنوی چار حصوں میں منقسم ہے جس میں مفضّل نامی ایک شخص امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور امام صبح سے شام تک کائنات کے ایک ایک ذرّے کی پیدائش اس کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہیں مثنوی میں شیعت کی تبلیغ کا جذبہ کارفرما ہے اور اس پر زیادہ توجہ ہونے کی بنا پر لکھنوی شاعری کی خصوصیات کو اُبھرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔صبا لکھنوی کی ''شکار نامہ واجد علی شاہ'' صید یہ مثنوی ہے۔اس میں نواب محسن الدولہ اور نواب احمد علی خاں وزیر سلطنت کے شکار کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔اِبتدا میں حمد، نعت اور منقبت حضرت علی ہے اس کے بعد بادشاہ کی تعریف ہے اور پھر لکھنؤ کا وصف بیان کیا گیا ہے جس میں لکھنؤ کی رونق، وہاں کے مشاغل ودل چسپیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

واجد علی شاہ اختر کی مثنویاں ''دریائے تعشق'' اور ''بحر الفت'' عشقیہ مثنویاں ہیں اور ''حزن اختر'' ان کی زندگی کے آخری زمانے کی عبرتناک داستان ہے اس لحاظ سے یہ سوانحی اور تاریخی مثنوی کہی جاسکتی ہے۔اس میں واجد علی شاہ نے قید خانہ کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اور اپنے حال زار کا بیان کیا ہے وہ انتہائی موثر ہے۔مثنوی میں لکھنؤ کا روزمرّہ اور بیگماتی زبان کا استعمال بڑی بے تکلفی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

دبستانِ لکھنؤ کی مثنوی ''گلزارِنسیم'' صحیح معنوں میں لکھنوی تہذیب ومعاشرت وہاں کے عیش پرست ماحول، حسن پرست مزاج اور لکھنوی شاعری کی امتیازی خصوصیات کی ترجمان ہے۔ مثنوی ''گلزارِنسیم ۱۲۵۴ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے اس کا قصہ طبع زاد نہیں ہے بلکہ ایک نثری داستان سے ماخوذ ہے۔ اس میں شہزادہ تاج الملوک اور بکاؤلی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ مثنوی گلزارِنسیم کا قصہ یا پلاٹ مربوط ومکمل ہے۔ قصہ مافوق الفطرت عناصر کے تابع ہے لیکن بیش تر کردار لکھنؤ تہذیب ومعاشرت میں پلے بڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اپنے عہد کے انسانوں کی عادات اطوار اور مزاج طور طریقوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ''گلزارِنسیم'' میں تہذیب ومعاشرت کی عکاسی کے موقع کم آئے ہیں لیکن جہاں بھی آئے ہیں نسیم نے لکھنؤ تہذیب ومعاشرت کی اور وہاں کے رسم ورواج کی تصویر کشی چابک دستی کے ساتھ کی ہے۔ گلزارِنسیم میں تاج الملوک کے باپ زین الملوک اور تاج الملوک کی ملاقات اور تاج الملوک وبکاؤلی کی شادی کے بیانات میں معاشرتی وتہذیبی زندگی کی تصاویر ملتی ہیں۔

مثنوی گلزارِنسیم کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز واختصار ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی میں نسیم نے لکھنوی شاعری کے لوازمات، صنعت گری، مضمون آفرینی، تکلف، تصنّع، رعایت لفظی، مبالغہ آرائی، تناسب لفظی اور نازک خیالی وغیرہ کو بڑی چابک دستی کے ساتھ برتا ہے جس کی بنا پر مثنوی لکھنو شاعری کا شاہ کار بن گئی ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے نواب مرزا شوق کی عشقیہ مثنویات ہیں ان کے کردار بھی سرزمین لکھنؤ کے جیتے جاگتے مردوزن ہیں۔ شوق کی مثنویوں کے پلاٹ طبع زاد ہیں۔ ان کی مثنویوں کی خصوصیات میں زبان وبیان کی دل کشی کے ساتھ موثر جذبات نگاری اور انسانی ذہن ونفسیات کی عکاسی ہے۔ شوق نے اپنی مثنویات میں لکھنؤ کے مٹتے ہوئے جاگیردارانہ دور کا نقشہ بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مثنویوں میں عشقیہ معاملات کے بیان میں عام انسانی زندگی کی سچائیوں کو ملحوظ رکھا ہے۔

شوق نے جذبات نگاری اور احساسات کے بیان میں بھی بڑی فن کاری دکھائی ہے ان کی مثنویوں کی بڑی خوبی لکھنؤ کی استعارات، تشبیہات، صنعتوں، اور فارسی ترکیبوں سے بوجھل زبان کے بجائے سیدھی سادی زبان ہے جس میں نسائیت کا لوچ اور گھریلو ماحول ہے جسے انہوں نے لکھنؤ کے روزمرّہ محاورات اور اشارات سے موثر بنایا ہے۔ قلق کی مثنوی ''طلسمِ الفت'' ۸۱۲/۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ مثنوی ۱۲۸۰ھ میں مکمل ہوئی تھی۔ ''طلسمِ اُلفت'' عشقیہ مثنوی ہے یہ مثنوی اپنے قصہ، پلاٹ واقعیت اور حقیقت نگاری کے لحاظ سے کمزور ہے۔ اس کی ادبی اہمیت اس کی زبان اور طرزِ ادا کی بنا پر ہے لیکن زبان کی شگفتگی، برجستگی اور روزمرّہ ومحاوروں کے استعمال کے سلسلے میں یہ مثنوی نواب مرزا شوق کی مثنویات کے معیار کو نہیں پہنچتی۔

04.06 قدیم رنگ کی مثنویات کا آخری دَور

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جب دہلی تباہ وبرباد ہوئی اسی طرح نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد لکھنؤ کی رونقیں بھی ماند پڑ گئیں۔ بادشاہوں، نوابوں، امیر وامراء کی دل چسپیاں ختم ہونے کی وجہ سے شعروادب کی محفلیں سونی ہوگئیں لیکن مثنوی نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ ایسے شاعر جنہوں نے قدیم صنف سخن میں اپنی فکری وشعری صلاحیتوں کا استعمال کیا ان میں امیر اللہ تسلیم، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، داغ دہلوی، شوق قدوائی، احسن لکھنوی، اور حفیظ جالندھری قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں امیر اللہ تسلیم کی دَست یاب مثنویاں نالۂ تسلیم، دل وجاں، شامِ غریباں، نغمہ مسلسل، تواریخ بدیع، تواریخ کامل، سفرنامۂ خسرو، تاریخ لوہارو اور خنجر عشق ہیں۔

منیرشکوہ آبادی کی مثنویاں ''معراج المضامین'' اور ''حجابِ زناں'' ہیں۔ ''معراج المضامین'' میں اسلامی عقائد اور خانوادۂ رسول اور اہلِ بیت اطہار کے واقعات وکرامات کا بیان ہے اور ''حجابِ زناں'' میں خواتین کو نیک صلاح دینے کے لئے بیوہ کی نیک لڑکی کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ دونوں مثنویاں زبان وبیان کے لحاظ سے دبستانِ لکھنؤ کے شعری محاسن کا نمونہ ہیں۔ مثنویاں اصلاحی اور تعلیمی انداز کی حامل ہیں۔ امیر مینائی نے کئی مثنویاں کہی ہیں ان کی مثنویات میں عاشقانہ مثنوی اور مثنوی ''کارنامہ عشرت'' قابلِ ذکر ہیں۔ ''عاشقانہ مثنوی'' کا کوئی عنوان نہیں دیا گیا ہے یہ ۳۳۵۱/اشعار پر مشتمل ہے یہ داستانی انداز کی مثنوی ہے۔ دوسری مثنوی ''کارنامۂ عشرت'' میں نواب کلب علی خاں کے بڑے بیٹے سید ذوالفقار علی خاں کی شادی کی تقریبات کا بیان ہے۔ امیؔر کی مثنویات میں کلام کی پختگی نمایاں ہے۔

محسنؔ کاکوروی کی مثنویات میں ''صبح تجلّی'' اور ''چراغ کعبہ'' مذہبی مثنویاں ہیں ان کے یہاں نامانوس مذہبی تلمیحات اور رمز وکنایات کی کثرت دُوراز کار استعارات اور عربی فارسی الفاظ اور تراکیب نے ان کی مثنویات کو مشکل بنا دیا ہے۔ داغؔ کی مثنوی ''فریادِ داغ'' ۸۳۸/ اشعار پر مشتمل ہے اس میں داغؔ نے کلکتہ کی طوائف منی بائی حجاب سے اپنی محبت کا قصہ اور ہجر ووصال کی مختلف کیفیات بیان کی ہیں۔ ''فریادِ داغ'' دلّی کے خاص رنگ کی آخری مثنوی ہے جس میں جذبات واحساسات کی مختلف کیفیات کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ زبان وبیان میں سادگی، سلاست اور روانی مثنوی کی خصوصیات ہیں۔ آخری دور کی مثنویوں میں شوق قدوائی کی ''ترانۂ شوق'' داستانی مثنوی اور ''عالمِ خیال'' تصوراتی مثنوی ہے جس میں بیوی پردیس گیے ہوئے شوہر کے بارے میں اپنے تصور سے نئے نئے نقشے بناتی ہے اور اپنے جذبات و محسوسات بیان کرتی ہے، احسن کے مثنوی ''جذب عشق'' کا انداز ''بہار عشق'' جیسا ہے یہ عشقیہ مثنوی ہے جس میں عشق کی اہمیت وقدر و قیمت واضح کی گئی ہے مثنوی لطف زبان، دل کش بیان اور سلاست وروانی کے لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہے۔

اس دور میں حفیظ جالندھری کی مثنوی ''شاہنامہ اسلام'' میں اسلام کے عروج کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس کی زبان صاف اور رواں ہے۔ واقعہ نگاری دل چسپ ہے۔ شاہنامہ میں اگر چہ رزمیہ کی شان نہیں ہے لیکن شاعر کی عقیدت مندی اور بیان میں شکوہ نے اسے رزمیہ کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ شاہ نامہ طویل مثنوی ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ حفیظ نے اتنی طویل نظم میں خیالات وواقعات میں تسلسل و ربط اور بیان میں دلآویزی کو برقرار رکھ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ اردو مثنوی کا یہ دور جسے آخری دور قرار دیا گیا ہے۔ اس دور میں مثنویات کا ایک بڑا ذخیرہ سامنے آیا اور بیش تر شعرا نے اپنے اپنے طور پر اس صنف پر طبع آزمائی کی لیکن میر تقی میؔر، میؔر حسن اور پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنویات کا سا معیار کسی مثنوی کو حاصل نہیں ہوا۔ اِسی دَور میں اردو شاعری میں جدید رجحانات سے دل چسپی پیدا ہوئی اور جدید رجحانات و خیالات کی بنا پر طوطا مینا کی کہانیوں، عشق ومحبت کے قصوں اور داستانی انداز کے واقعات سے شعرا کی دل چسپی کم ہوگئی۔

حقیقت پسندی اور اصلیت کے رجحان نے تخیل وتصوّراتی فضا کی چمک دمک ختم کر دی۔ شاعر نے حقیقت کی ٹھوس زمین پر کھڑے ہوکر جب زندگی کی سچائیوں پر نظر ڈالنا شروع کیا تو اس کے سامنے بے حساب موضوع آ گئے۔ چنانچہ جدید شاعری کی تحریک کے زیر اثر قدیم رنگ کی یا قدیم انداز کی مثنویاں لکھنے کا رجحان ختم ہوگیا اور مثنوی کی ہیئت کو نئے موضوعات اور جدید خیالات کے اظہار کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور مثنوی کی ہیئت نظم کی وسیع قلمرو میں ضم ہوگئی۔ شمالی ہند میں اردو مثنوی کے اِرتقا کا سفر جو افضل کی ''بکٹ کہانی'' سے شروع ہوکر حفیظ جالندھری کی مثنوی ''شاہنامہ اسلام'' تک پھیلا ہوا ہے تقریباً دوسو سال کی مدت پر محیط ہے۔

اس دور کی مثنویات کے جائزہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں مثنوی کی صنف شعرا کی توجہ اور دل چسپی کا اہم مرکز رہی ہے اور شعرا نے اپنے طور پر پر مختلف کیفیات، مختلف معاملات، واقعات، حالات، اعتقادات وغیرہ کو مثنویات کا موضوع بنا کر اس کے دامن کو وسعت عطا کی۔ عشق ومحبت کے واقعات اور داستانی قصے اگر چہ مثنویات کے غالب موضوعات رہے اور ہجر ووصال کے جذبات کو اہمیت حاصل رہی لیکن اسی کے ساتھ ساتھ عام زندگی کی کلفتوں، پریشانیوں کو بھی موضوع بنایا گیا مثلاً میر کی مثنویات مذمت برشگال، ننگ نامہ اور مذمت کذب اور سوداؔ کی ہجو شیدی فولاد خاں کو توال اور پیل راجہ نریت سنگھ، موسم گرما اور ہجو امیر بخیل وغیرہ قائم کی مثنوی شدتِ سرما، جرأت کی بیان شدت سرما، مصحفی کی افراط سرما وغیرہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مثنوی محض عشق ومحبت کے بیان تک محدود نہیں رہی اسی طرح شمالی ہند میں واقعاتی مثنویوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔

میرؔ نے ''شکار ناموں'' میں واقعات کا بیان کیا ہے تو صبا لکھنوی نے ''صید نامہ'' میں شکار کے واقعات بیان کیے ہیں۔ اس دور میں ایسی مثنویاں وجود میں آئیں جن میں مذہب کو موضوع بنایا گیا۔ منیرؔ نے ضخیم مثنوی ''معراج المضامین'' میں ائمہ کے معجزات کا بیان کیا۔ محسنؔ نے کئی مختصر مثنویاں لکھیں جن میں ''صبحِ تجلّی'' اور ''چراغِ کعبہ'' سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔ امیر مینائیؔ نے نور تجلّی، ابرِ کرم، قصہ اویس قرنی اور قصہ یہودی لکھیں تو حفیظ جالندھری نے شاہنامہ اسلام لکھ کر تاریخ اسلام کے مختلف ابواب کو روشن کیا۔ اسلامی عقائد کے ساتھ مثنویات میں ہندو مذہب کی نمائندگی بھی ہوئی۔ رامائن اور گیتا کو کئی مثنوی نگار شعرا نے مثنوی کا جامہ پہنایا۔ مثلاً شایانؔ نے مہابھارت لکھی اس کے علاوہ اُردو مثنوی میں سنسکرت کے شہ پاروں کو مثنوی میں نظم کیا۔ اردو مثنویات میں جہاں تک تہذیب، معاشرت اور تاریخی واقعات کی پیش کش کا تعلق ہے۔ اگر چہ شمالی ہند میں ایسی کوئی ضخیم مثنوی وجود میں نہیں آئی جس میں تاریخی واقعہ کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن ایسی مثنویوں کی تعداد کم نہیں ہے جن میں تاریخی حالات بیان کیے گیے ہیں۔ میر جعفر کی ظفر نامہ اورنگ زیب، شاہ عالم گیر بادشاہ غازیؔ، واجد علی شاہ کی حزن اختر اس کی مثال ہے۔ معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی تقریباً ہر ایک عشقیہ مثنوی کا لازمی حصہ رہا ہے۔

ہماری معاشرتی اور تہذیبی زندگی رسم ورواج، طور طریقوں، طرزِ زندگی کی جتنی جان دار تصویر اور حقیقت سے بھرپور تفصیلات مثنویوں میں نظر آتی ہیں کسی دوسری صنف شاعری میں مفقود ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ مثنویات ایسا آئینہ خانہ ہیں جن میں ہندوستانی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے بے حساب رنگ جلوہ گر ہیں۔ شمالی ہند کی مثنویات شعری محاسن اور زبان وبیان کی خصوصیات کے لحاظ سے بھی امتیازی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثنوی گو شعرا نے مثنویات میں واقعہ نگاری، منظر نگاری، جذبات نگاری، سراپا نگاری اور تقریبات، جلسوں، جلوسوں، بزم آرائیوں کے بیان میں جا بجا اپنی فن کاری اور خلّاقانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے اور دل کش تشبیہات، نادر استعارات معنی خیز تراکیب کا برمحل استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ جا بجا صنائع بدائع کا اور روز مرّہ محاوروں کا استعمال کر کے شعری زبان کو وسعت ودل کشی عطا کی ہے۔

شمالی ہند کی مثنویات میں زبان وبیان کی صفائی، سادگی، سلاست، روانی اور برجستگی اور شگفتگی کے نمونے بھی ملتے ہیں جس کی مثال مثنوی ''خواب وخیال'' اور ''سحر البیان'' سے دی جاسکتی ہے تو اعلیٰ ترین فن کاری کے وہ نمونے بھی ملتے ہیں جن پر شاعری فخر کر سکتی ہے۔ نسیم کی مثنوی ''گلزار نسیم'' اور نواب مرزا شوق کی مثنویات اس کی مثال کے لئے پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ شمالی ہند کی مثنویات نے مثنوی کے اِرتقا کے اس سفر کو جو دکن سے شروع ہوا تھا فن کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیا۔

04.07 خلاصہ

شمالی ہند کی پہلی مکمل مثنوی افضلؔ کی ''بکٹ کہانی'' ہے اس کا موضوع ہندی شاعری کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں اظہارِ عشق عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ شمالی ہند میں ابتدائی دور میں مذہبی مثنویاں لکھی گئی ہیں جن میں امینؔ کی فقۂ ہندی، محبوب عالم شیخ جیون کا محشر نامہ اور درد نامہ خاص ہیں۔ ابتدائی دور میں جو اہم مثنویات وجود میں آئیں ان مین جعفر زٹلی کی طوطی نامہ اور ظفر نامہ اورنگ زیب، فائزؔ کی مناجات، درمدح شاہ ولایت، حاتم کی مثنوی بہاریہ اہم ہیں۔ مثنوی کے اصل فروغ کا زمانہ سوداؔ اور میر تقی میرؔ کی مثنویات سے شروع ہوتا ہے۔ سوداؔ اور میرؔ نے عشقیہ موضوعات کے علاوہ مختلف موضوعات پر مدحیہ اور ہجویہ مثنویاں لکھ کر مثنوی کے دامن کو وسیع کیا۔ میرؔ کے بعد ابتدائی زمانے کی اہم مثنوی نواب محبت خاں محبت کی ''اسرار محبت'' ہے جس میں سرزمین پنجاب کے ایک عشقیہ افسانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اس دور کی دوسری مثنویات میں حسرتؔ کی مثنوی طوطی نامہ، قائم کی حیرت افزا اور جذبۂ الفت قابلِ ذکر ہیں۔ اس زمانے کی مقبول مثنوی میر اثرؔ کی ''خواب وخیال'' ہے جو تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس میں قصہ برائے نام ہے۔ عشقیہ جذبات کی شدت بیان کی گئی ہے آخر میں معرفت کے معاملات بھی بیان کیے گیے ہیں۔ زبان کی صفائی، شستگی اور بیان کے تسلسل اور روانی کے لحاظ سے یہ امتیازی مقام رکھتی ہے۔ خواب وخیال کے بعد اردو مثنوی کے اِرتقا میں میر حسنؔ کی مثنویاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں انہوں نے گیارہ مثنویاں لکھی ہیں لیکن ان کی مثنویات میں عارفانہ مثنوی ''رموز العارفین'' مذہبی مثنویات میں قابل قدر ہے تو ''مثنوی سحر البیان'' داستانی مثنویات میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے اور واقعات نگاری، منظر نگاری، سراپا نگاری، تہذیب ومعاشرت کی مرقع کشی، رسم ورواج اور عقائد کے بیانات جذبات نگاری اور محاکات کے ساتھ زبان وبیان کے لطف سادگی، صفائی، روانی وتسلسل کے اعتبار سے بے مثال ہے۔ سحر البیان کے ساتھ اور بعد میں جو مثنویاں سامنے آتی ہیں۔ ان میں مصحفی کی ''بحر المحبت''، ''شعلہ شوق''، 'جذبۂ عشق''، ''گلزار شہادت'' انشاؔ کی ہجویہ مثنویاں، جرأت کی ''بحر الفت''، ''درصفت سراپائے معشوق'' اور ''کارستانِ الفت'' رنگین کی ''مثنوی دلپذیر'' مومن کی مثنویات نے مثنوی کے فروغ میں خاطر خواہ حصہ لیا۔ دبستانِ دہلی کے اُجڑنے کے بعد جب لکھنؤ شعروادب کا مرکز قرار پایا تو یہاں بھی مثنوی نگاری کو فروغ حاصل ہوا۔

لکھنؤ کا ماحول طربیہ ماحول تھا، عیش ونشاط کے ماحول اور تہذیبی ومعاشرتی زندگی میں تکلف، تصنع، رعنائی ورنگینی کی فضاؤں نے وہاں کی شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے جس کے اثرات مثنوی پر بھی مرتب ہوئے جس کی بنا پر مثنویات میں عشقیہ جذبات کے اظہار میں بے باکی، عریانی اور لذت اندوزی پیدا ہوگئی اس کے علاوہ امامیہ حکومت اور ماحول کے اثرات نے امام باڑوں، درگاہوں، مجلسوں کی اہمیت میں اضافہ کردیا ادھر لکھنؤ میں شاعری میں زبان کی صفائی، شستگی اور صنعت کاری، مبالغہ آرائی، تصنع، بناوٹ، نفاست، نزاکت، مرصع سازی پر زور دیا گیا ہے ان تمام رجحانات کے نتیجہ میں لکھنؤ کی مثنویات میں دہلی کے بسنت ایک علاحدہ رنگ نے جگہ حاصل کی چنانچہ دبستانِ لکھنؤ کی مثنویات میں ناسخ کی مثنوی سراج نظم، نسیمؔ کی گلزار نسیم، صباؔ کی شکار نامہ واجد علی شاہ، واجد علی شاہ اخترؔ کی حزن اختر، خاقان سرور، دریائے تعشق اور بحر الفت اور نواب مرزا شوق کی زہر عشق، بہار عشق، اور فریب عشق اور قلقؔ کی مثنوی طلسم الفت میں سے بیش تر مثنویات لکھنوی مذاق کی آئینہ دار ہیں ان میں دیا شنکر نسیمؔ کی مثنوی ''گلزار نسیم'' جو گل بکاؤلی کے افسانے پر مشتمل ہے۔ اور نواب مرزا شوق کی مثنویات جو معاملات عشق کے بیان پر مبنی ہیں جہاں لکھنؤ رنگ کی نمائندہ ہیں وہیں لکھنوی تہذیب وتمدن کی اور طرز زندگی کی ترجمان ہونے کے ساتھ لکھنؤ کی شاعری کے محاسن کی عکاس ہیں۔

آخری دَور کی کی مثنوی امیر اللہ تسلیم کی مثنوی نالۂ تسلیم، شامِ غریباں، تاریخ لوہارو، خنجرِ عشق، منیر شکوہ آبادی کی مثنویات معراج المضامین اور حجاب زَناں، امیر مینائی کی بغیر عنوان کی عاشقانہ مثنوی اور کارنامہ عشرت، محسن کاکوروی کی صبح تجلّی اور چراغ کعبہ داغ دہلوی کی مثنوی فریادِ داغ، شوق قدوائی کی ترانہ شوق، احسن کی جدت عشق اور حفیظ جالندھری کی طویل مثنوی شاہنامہ اسلام جس میں اسلام کے عروج کی داستان بیان کی گئی ہے قابلِ ذکر ہیں۔اس آخری دور میں اگر چہ مثنویات کا ایک بڑا ذخیرہ ملتا ہے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں نیے رجحانات کی مقبولیت اور حقیقی وواقعی زندگی کے معاملات سے دل چسپی نے شعرا کو تخیلی اور تصوراتی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دھرتی پر لا کھڑا کیا۔عام زندگی کے عام معاملات سے دل چسپی بڑی تو خواب وخیال کی فضاؤں کا طلسم ٹوٹ گیا اور نظم نگاری کی مقبولیت سے دھیرے دھیرے قدیم انداز کی مثنوی نگاری سے دل چسپی کم ہوگئی۔

ذیل میں اس اکائی کی خصوصیات پیش کی گئی ہیں:

﴿۱﴾ شمالی ہند میں اب تک مثنویات کے جو نمونے دَست یاب ہوئے ہیں ان میں سب سے زیادہ مکمل مثنوی افضل کی 'بکٹ کہانی' ہے۔﴿۲﴾ شمالی ہند کے ابتدائی دور کے مثنوی نگار شعرا، میر جعفر زٹلی، فائز دہلوی، شاہ مبارک، شاہ حاتم اور فضائل علی خاں قابلِ ذکر ہیں۔ ﴿۳﴾ شمالی ہند میں مثنوی کے معیاری نمونے سودا اور میر تقی میر کے زمانے سے ملنا شروع ہوتے ہیں۔﴿۴﴾ میر کی مثنویوں کی تعداد ۳۴ ہے ﴿۵﴾ میر نے کئی موضوعات پر مثنویاں لکھی ہیں لیکن ان کی عشقیہ مثنویاں ۱: اعجاز عشق ۲: شعلۂ عشق ۳: دریائے عشق ۴: جوشِ عشق ۵: معاملاتِ عشق ۶: عشق افغان پسر اور مور نامہ خاص اہمیت کی حامل ہیں۔﴿۶﴾ شمالی ہند کی مثنوی ''اسرار محبت'' سرزمین پنجاب کے مشہور عشقیہ افسانے پر مشتمل ہے مثنوی کا ہیرو پنوں اور ہروئن سمی ہے۔﴿۷﴾ حسرت کی مثنوی ''طوطی نامہ'' داستانی مثنوی ہے۔﴿۸﴾ مثنوی ''خواب وخیال'' میں کوئی قصہ نہیں ہے بلکہ ہجر ووصال'' آرزوئے وصل، راز ونیاز، چھیڑ چھاڑ اور عشق وعاشقی کی مختلف کیفیات اور واردات کا بیان کیا گیا ہے۔ ﴿۹﴾ مثنوی ''سحر البیان'' میں بے نظیر اور بدرِ منیر کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔مثنوی کا پلاٹ طبع زاد ہے لیکن اس کے مختلف اجزاء الف لیلہ اور فارسی مثنویوں اور فارسی کی داستانوں سے لیے گیے ہیں۔

﴿۱۰﴾ مثنوی سحر البیان میں میر حسن نے واقعہ نگاری، جزئیات نگاری، منظر نگاری، تہذیب ومعاشرت کی عکاسی، کردار نگاری اور جذبات نگاری میں اپنے غیر معمولی مشاہدہ کی صلاحیت، باریک بینی، بے مثال تخیل آفرینی اور فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔﴿۱۱﴾ شمالی ہند میں دبستان دہلی کے مثنوی نگاروں میں میر حسن کے علاوہ مصحفی، انشا، جرأت، راسخ، رنگین اور مومن خاں مومن کو اہم مثنوی نگار مانا گیا ہیں۔ ﴿۱۲﴾ دبستان دہلی میں دو عارفانہ مثنویاں بھی لکھی گئیں ان میں مثنوی ''رُموز العارفین'' میں فارسی کی صوفیانہ مثنویات سے استفادہ کیا ہے اور شکایت کے پردے میں معرفت واخلاقی باتوں کی تلقین کی ہے اور راسخ کی مثنوی ''نور الانظار'' میں بے ثباتیِ دنیا، منازل سلوک اور مذہبی عقائد بیان کیے گیے ہیں۔یہ مثنویاں زبان وبیان کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہیں۔﴿۱۳﴾ لکھنؤ کے عیش وعشرت کے رجحان اور رنگین مزاجی کی بنا پر یہاں زیادہ تر عشقیہ مثنویاں لکھی گئیں۔

﴿۱۴﴾ لکھنوی مثنویات کی بڑی خصوصیت زبان وبیان کی رنگینی، رعایت لفظی، ضلع جگت، صنائع بدائع کے استعمال کی کثرت، مبالغہ آرائی کے علاوہ دل کش تشبیہات، نادر استعارات، دل نشیں تراکیب اور فارسی الفاظ کا استعمال ہے۔﴿۱۵﴾ دبستانِ لکھنؤ کے مثنوی نگار

شعرا اس میں ناسخ، نسیم لکھنوی، صبا لکھنوی، واجد علی شاہ اختر، نواب مرزا شوق اور قلق قابلِ ذکر ہیں۔ ﴿۱۶﴾ ناسخ کی مثنوی ''سراج نظم'' روایات اور احادیث کے ترجمہ پر مشتمل ہے۔ مثنوی چار حصوں میں منقسم ہے جس میں مفضل نام کا ایک شخص امام جعفر صادق کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور امام صبح سے شام تک کائنات کے ایک ایک ذرّے کی پیدائش اس کی ضرورت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ﴿۱۷﴾ واجد علی شاہ کی مثنوی ''حزن اختر'' میں ان کے آخری زمانے کی عبرتناک داستان نظم کی گئی ہے اور قید خانے کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ﴿۱۸﴾ مثنوی گلزار نسیم داستانی مثنوی ہے جس میں تاج الملوک اور بکاؤلی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے اس کا قصہ طبع زاد نہیں ہے بلکہ ایک نثری داستان سے ماخوذ ہے۔ مثنوی کا پلاٹ مربوط اور مکمل ہے۔ مثنوی کی سب سے بڑی خوبی اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ مثنوی میں نسیم نے لکھنوی شاعری کے لوازمات کو بڑی چابک دستی کے ساتھ برتا ہے۔

﴿۱۹﴾ مرزا شوق کی مثنویات زہر عشق، بہار عشق اور فریب عشق کے پلاٹ طبع زاد ہیں۔ شوق نے اپنی مثنویات میں لکھنؤ کے مٹتے ہوئے جاگیردارانہ دور کا نقشہ بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے اس کے علاوہ انہوں نے اپنی مثنویات میں عشقیہ معاملات کے بیان میں عام انسانی زندگی کی سچائیوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ ﴿۲۰﴾ قلق کی مثنوی ''طلسم الفت'' ۷۸۱۲/ اشعار پر مشتمل ہے یہ مثنوی ۱۲۸۰ھ میں مکمل ہوئی تھی، طلسم الفت عشقیہ مثنوی ہے۔ یہ مثنوی اپنے قصہ، پلاٹ، واقعیت اور حقیقت نگاری کے لحاظ سے کمزور ہے۔ اس کی ادبی اس کی زبان اور طرزِ ادا کی بنا پر ہے لیکن زبان کی شگفتگی، برجستگی اور روزمرہ و محاوروں کے سلسلہ میں یہ مثنوی نواب مرزا شوق کی مثنویات کے معیار کو نہیں پہنچتی۔ ﴿۲۱﴾ سرزمین لکھنؤ کی رونقیں ماند پڑنے کے بعد جب شعر و ادب کی محفلیں سونی ہوگئیں لیکن مثنوی نگاری کا سلسلہ جاری رہا۔ ایسے شعرا جنہوں نے قدیم صنف سخن میں اپنی فکری اور شعری صلاحیتوں کا استعمال کیا ان میں امیر اللہ تسلیم، منیر شکوہ آبادی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، داغ دہلوی، شوق قدوائی، احسن لکھنوی اور حفیظ جالندھری قابلِ ذکر ہیں۔

﴿۲۲﴾ داغ دہلوی کی مثنوی ''فریاد داغ'' دلّی کے خاص رنگ کی آخری مثنوی ہے جس میں جذبات و احساسات کی مختلف کیفیات کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ﴿۲۳﴾ آخری دَور کی مثنویات میں شوق قدوائی کی ''ترانہ شوق'' داستانی مثنوی ہے تو احسن کی مثنوی ''جذب عشق'' عشقیہ مثنوی ہے جس میں عشق کی اہمیت اور قدر و وقعت واضح کی گئی ہے۔ ﴿۲۴﴾ حفیظ جالندھری کی مثنوی ''شاہنامہ اسلام'' طویل مثنوی ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے حفیظ نے اتنی طویل نظم میں خیالات و واقعات میں تسلسل و ربط اور بیان میں دلآویزی کو برقرار رکھ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ ﴿۲۵﴾ جدید شاعری کی تحریک کے زیر اثر قدیم رنگ کی یا قدیم انداز کی مثنویاں لکھنے کا رجحان ختم ہوگیا اور مثنوی کی ہیئت کو نئے موضوعات اور جدید خیالات کے اظہار کے لئے استعمال کیا جانے لگا اور مثنوی کی ہیئت نظم کی وسیع قلمرو میں ضم ہوگئی۔

04.08 فرہنگ

اختصار	: چھانٹا ہوا، کم کیا ہوا	غمّاز	: چغل خوری، اشارہ بازی
اطراف	: طرف کی جمع، آس پاس	فقہ	: شرعی مسائل
ایجاز	: مختصر	قدروں	: اچھائیوں
بازگشت	: واپسی، پلٹنا	قلمرو	: راج، عمل داری
برجستگی	: بے ساختہ، بے تکلفی	کج روی	: بری روش، ٹیڑھی چال

پُرآشوب	: فتنوں سے بھرا ہوا	کلفت	: رنج، تکلیف
تخیل پسندی	: خیالی اور تصوراتی چیزیں پسند کرنا	کوائف	: کیفیت کی جمع
ترجمانی	: ترجمہ کرنا	لوازمات	: سامان، اسباب
تلامذہ	: شاگرد، طالب علم	مافوق الفطرت	: فطرت سے اوپر
تمثیلی	: مثالی، مشابہت	ماند	: مدھم، بے رونق
جامہ	: پوشاک، لباس	محاسن	: خوبیاں
جزئیات	: چھوٹے چھوٹے حصے	محیط	: حاوی ہونا، چھا جانا
چابک دستی	: چابک دستی	مدحیہ	: تعریفی، ستائشی
حسّیت	: محسوس کرنا	مربوط	: بندھا ہوا
خلاّقانہ	: تخلیقی قوت	مرقعے	: تصاویر
دَست یاب	: حاصل ہونا	مستند	: سند پایا ہوا، تصدیق کیا ہوا
دقیق	: مشکل	مضمر	: پوشیدہ
دُوراز کار	: دیر سے سمجھ میں آنے والا	معجزہ	: حیرت میں ڈالنے والی بات
رندانہ	: اوباشانہ، آزادانہ، شرابی	معرکہ آرائی	: جنگ
روح فرسا	: روح کو تڑپانے والے	معنی خیز	: معنی سے بھرا ہوا
شاہ کار	: سب سے بڑا کارنامہ	مہمات	: لڑائیاں، جنگیں، بڑے کام
شکوہ	: رعب، شان وشوکت	نامانوس	: اجنبی، بیگانہ
ضم	: شامل کرنا	نظارے	: مناظر
طبع آزمائی	: طبیعت کی رسائی کا امتحان	وصل	: ملاپ
طبعی	: ذاتی، فطری	ہجویہ	: مذمت یا برائی
عارفانہ	: خداشناسی کا علم	ہم کنار	: بغل گیر، ہم آغوش، گلے ملنا

04.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ افضلؔ کی مثنوی ''بکٹ کہانی'' پر تبصرہ کیجیے۔

سوال نمبر۲ مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کی خاص خوبیاں بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ میر اثرؔ کی مثنوی ''خواب وخیال'' پر ایک نوٹ لکھیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ میر تقی میرؔ کی مثنوی نگاری سے بحث کیجیے۔

سوال نمبر۲ شمالی ہند میں ابتدائی دور کی مثنویات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر۳ میر حسن کی مثنوی ''سحر البیان'' کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : مثنوی ''ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر بادشاہ غازی'' کے شاعر کا نام کیا ہے؟

(الف) شاہ مبارک آبرو (ب) فضل علی خاں فضلیؔ (ج) فائزؔ دہلوی (د) میر جعفر زٹلی

سوال نمبر۲ : مثنوی ''خواب وخیال'' کے اشعار کی تعداد کیا ہے؟

(الف) دوسو پچاس/۲۵۰ (ب) تین سو تیراسی/۳۸۳ (ج) تین ہزار/۳۰۰۰ (د) پانچ سو/۵۰۰

سوال نمبر۳ : میر حسنؔ کی کلیات میں شامل مثنویوں کی تعداد کتنی ہے؟

(الف) پندرہ/۱۵ (ب) گیارہ/۱۱ (ج) اکتالیس/۴۱ (د) تینتالیس/۴۳

سوال نمبر۴ : مثنوی ''حزنِ اخترؔ'' کا شاعر کون ہے؟

(الف) صباؔ لکھنوی (ب) مصحفیؔ (ج) واجد علی شاہ اختر (د) نواب مرزا شوقؔ

سوال نمبر۵ : مثنوی ''معراج المضامین'' کے شاعر کا نام کیا ہے؟

(الف) منیر شکوہ آبادی (ب) محسنؔ کاکوروی (ج) امیر مینائی (د) داغؔ دہلوی

سوال نمبر۶ : ''معاملات'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) معاملہ (ب) عامل (ج) اعمال (د) معمول

سوال نمبر۷ : ''رسم'' کی جمع کیا ہے؟

(الف) مراسم (ب) رسوم (ج) راسم (د) ارسام

سوال نمبر۸ : ''معیار'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) خوبی (ب) انتخاب (ج) کسوٹی (د) پاکیزہ

سوال نمبر۹ : ''طویل'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) بڑا (ب) زیادہ (ج) درمیانی (د) مختصر

سوال نمبر۱۰ : ''جوشِ عشق'' کس کی مثنوی ہے؟

(الف) سوداؔ (ب) میرؔ (ج) ذوقؔ (د) ولیؔ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (د) میر جعفر زٹلی	جواب نمبر۶	: (الف) معاملہ
جواب نمبر۲	: (ج) تین ہزار	جواب نمبر۷	: (ب) رسوم
جواب نمبر۳	: (ب) گیارہ	جواب نمبر۸	: (ج) کسوٹی
جواب نمبر۴	: (ج) واجد علی شاہ	جواب نمبر۹	: (د) مختصر
جواب نمبر۵	: (الف) منیر شکوہ آبادی	جواب نمبر۱۰	: (ب) میرؔ

04.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو مثنوی کا اِرتقا شمالی ہند میں	از	سید محمد عقیل رضوی
۲۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں	از	ڈاکٹر گیان چند جین
۳۔ اردو کی تین مثنویاں	از	خان رشید
۴۔ اردو مثنوی کا اِرتقا	از	عبدالقادر سروریؔ

بلاک نمبر 02

اکائی 05	مُلّا وجہی: مثنوی قطب مشتری	پروفیسر آفاق حُسین صدیقی
اکائی 06	میر حسن: مثنوی سحر البیان	ڈاکٹر اختر علی
اکائی 07	پنڈت دیا شنکر نسیم: مثنوی گلزارِ نسیم	ڈاکٹر اختر علی
اکائی 08	مرزا شوق لکھنوی: مثنوی زہرِ عشق	محمد افضل حُسین

اکائی 05 مُلّا وجہی: مثنوی قطب مشتری

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد

05.02 : تمہید

05.03 : مُلّا وجہی کے حالاتِ زندگی

05.04 : قطب مشتری کا تعارف

05.05 : قطب مشتری کا جائزہ

05.06 : خلاصہ

05.07 : فرہنگ

05.08 : سوالات

05.09 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

ملا وجہی کی مثنوی ''قطبِ مشتری'' دکن کے ابتدائی دور کی طبع زاد مثنویوں میں سے ایک ہے، مثنوی کی فکری اور فنی خصوصیات کو واضح کر کے اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنا۔ ملّا وجہی سے متعارف کرانے کے لئے اس کے حالاتِ زندگی اور ادبی خدمات کی معلومات بہم پہنچانا۔ شاعری کے بارے میں وجہی کے نظریات سے واقف کرانا۔ ''قطب مشتری'' کا تعارف کرانا۔ ''قطب مشتری'' کے قصے سے واقف کرانا اور اس قصہ کی نوعیت سے آگاہ کرنا۔ ''قطب مشتری'' کے پلاٹ کی خصوصیات سے آگاہ کرنا، پلاٹ کی خوبیوں اور خامیوں سے روشناس کرانا۔ مثنوی کے کرداروں سے متعارف کرانا اور ان کی خوبیوں وخامیوں کی وضاحت کرنا۔ وجہی کی کردار نگاری سے طلبا کو واقف کرانا۔

مثنوی میں سراپا نگاری کی اور جذبات نگاری کی خصوصیات سے آگاہ کرنا۔ مثنوی میں پیش کی گئی اس دور کی معاشرت، تہذیب اس زمانے کی رسوم، رواجوں وغیرہ سے آگاہ کرنا اور ان کی پیش کش کی خوبیوں وخامیوں سے آگاہ کرنا۔ مثنوی کے فنّی لوازمات کے استعمال کی طرف توجہ دلانا اور ان کی وضاحت کر کے طلبا کو ان کی خوبیوں سے واقف کرانا مثنوی میں استعمال کی گئی زبان کی خصوصیات سے واقف کرانا۔ اس دور کی دوسری مثنویات کے پیش نظر ''قطبِ مشتری'' کی ادبی اہمیت واضح کرنا۔ ملّا وجہی کے شاعرانہ مرتبہ ومقام سے آگاہ کرانا۔ طلبا میں کسی بھی فن پارے کا صحیح طور پر مطالعہ کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کی عادت ڈالنا۔ فن پارے کی مختلف خصوصیات کا جائزہ لینے کی صلاحیت کو اُبھارنا۔ فن پارے کے محاسن اور معائب کا شعور پیدا کرنا۔

05.02 تمہید

اُردو مثنوی کے آغاز اور اِرتقا کے سلسلہ میں سرزمین دکن کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ دکن میں اردو شاعری کا ابتدائی دور اردو میں مثنوی کا بھی ابتدائی دَور ہے۔ اردو شاعری کی اِبتدا میں چوں کہ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام نے حصہ لیا تھا چنانچہ مثنوی کو انہوں نے مذہب کی تبلیغ اور صوفیانہ عقائد کی نشر و اشاعت کا وسیلہ بنایا جس کی وجہ سے دکن کی ابتدائی دور کی مثنویات میں جا بجا مذہب سایہ فگن نظر آتا ہے۔

جس کی مثال کے لئے اشرفؔ کی مثنوی نوسرہار، فیروز بیدریؔ کی پرت نامہ اور توصیف نامہ، میران محی الدین، شاہ میراں جی شمس العشاقؔ کی مغز مرغوب، خوش نامہ اور شہادت الحقیقت، شاہ برہان الدین جانمؔ کی ارشاد نامہ، اور شیخ محمد چشتیؔ کی خوب ترنگ اور قصص الانبیاء وغیرہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

دراصل دکن میں اردو مثنوی میں ادبی حسن یا ادبیت پیدا کرنے کے رجحان کی با قاعدہ ابتدا بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد شروع ہوئی۔ بہمنی حکومت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ خودمختار سلطنتیں قائم ہوئیں۔

﴿۱﴾ بیجاپور میں عادل شاہی ﴿۲﴾ گولکنڈہ میں قطب شاہی ﴿۳﴾ احمد نگر میں نظام شاہی

﴿۴﴾ برار میں عماد شاہی ﴿۵﴾ بیدر میں برید شاہی

دکن کی درج بالا پانچ خودمختار سلطنتوں میں اگرچہ پانچوں سلطنتوں کے حکمرانوں نے علم و ادب سے دل چسپی لی لیکن بیجاپور کی عادل شاہی اور گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنتوں کے حکمرانوں کی علم و ادب سے غیر معمولی دل چسپی نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو شعر و ادب کا مرکز بنا دیا ان میں سے گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا بانی سلطان قلی قطب شاہ تھا جس نے ۹۲۴ھ مطابق ۱۵۱۸ء میں قطب شاہی سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے بعد اس خاندان کے سات حکمرانوں نے گولکنڈہ پر حکومت کی۔ سلطان قلی کے زمانے سے ہی گولکنڈہ علم و ادب و شعر و سخن کا مرکز بننا شروع ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا اور قطب شاہی خاندان کے پانچویں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

محمد قلی قطب شاہ خود ایک صاحبِ دیوان اور بلند پایہ شاعر تھا۔ اس نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی اور ریختی وغیرہ میں طبع آزمائی کر کے اپنی اعلیٰ شاعرانہ صلاحیت کا ثبوت دیا۔ محمد قطب شاہ کے دور میں اُردو کی دوسری اصنافِ سخن کے ساتھ مثنوی کی صنف بھی اِرتقا کی نئی منزلوں کی جانب گامزن ہوئی اور اس میں ادبی شان پیدا کرنے کی غرض سے عشقیہ واقعات اور داستانی قصوں کو موضوع بنایا گیا اور ادبی محاسن پر توجہ دی جانے لگی، شیخ احمد شریف گجراتی کی مثنویات ''یوسف زلیخا'' اور ''لیلیٰ مجنوں'' مثنوی میں ادبیت پیدا کرنے کے رجحان کی غمّاز ہیں مُلّا وجہیؔ کی مثنوی ''قطبِ مشتری'' بھی اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔

05.03 مُلّا وجہیؔ کے حالاتِ زندگی

''قطب مشتری'' کا مصنف ملّا وجہیؔ اپنے دور کا بڑا ادیب اور شاعر تھا۔ اس کا فارسی دیوان جو سالارِ جنگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اصل نام اسد اللہ خاں تھا اور فن شعر میں اس نے مرزا محمد امین روح الامین وزیر سلطنت سے اصلاح لی تھی۔ وجہیؔ کے تخلص کے بارے میں بھی محققین کا خیال ہے کہ اپنی مختلف کتابوں میں اس نے اپنا تخلص کہیں وجہی، کہیں وجیہ اور کہیں وجہ بھی استعمال کیا ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ مقبول تخلص وجہیؔ ہی ہے۔

وجہی کے اصل وطن کے بارے میں بھی کوئی مستند شہادت نہیں ملتی۔ بعض شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بزرگ خراسان سے گولکنڈہ آئے تھے۔ وجہی کی پیدائش کے زمانے کے بارے میں بھی محققین نے الگ الگ آراء قائم کی ہیں۔ ڈاکٹر جاوید وششٹ مرتب ''قصۂ حسن ودل''، یعنی ''سب رس'' نے اس کی پیدائش کا زمانہ ۹۶۰ھ اور ۹۶۵ھ کے درمیان قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر حمیرہ جلیلی نے سب رس کی تنقیدی تدوین میں اس کی پیدائش کا زمانہ ۹۶۸ھ اور ۹۷۳ھ کے درمیان قرار دیا ہے۔ وجہی نے طویل عمر پائی تھی۔ محققین کا خیال ہے کہ اس نے قطب شاہی دور کے چار سلاطین ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کی حکمرانی کا زمانہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنی شاعری کا آغاز عہدِ ابراہیم قطب شاہ میں کیا تھا، محمد قطب شاہ کے عہد میں اسے معتوب کر دیا گیا اور اس نے عسرت میں زندگی گزاری۔

عبداللہ قطب شاہ کے دورِ حکومت میں اس کا ستارہ پھر چمکا اور اس نے ۱۰۴۵ھ مطابق ۱۶۳۵ء میں ''سب رس'' تصنیف کی جسے اردو کی پہلی ادبی تصنیف کا درجہ حاصل ہے۔ وجہی کی وفات کی صحیح تاریخ کا پتہ نہیں چلتا۔ خیال ہے کہ اس کی وفات ۱۰۶۶ھ اور ۱۰۸۱ھ کے درمیان کے زمانہ میں ہوئی اس کے لئے یہ استدلال ہے کہ ابن نشاطی نے ''پھول بن'' میں جو ۱۰۶۶ھ کی تصنیف ہے ان تمام اساتذہ شعرا کا ذکر کیا ہے جو وفات پا چکے تھے ان میں وجہی کا تذکرہ نہیں ہے اور طبعی نے اپنی مثنوی ''بہرام وگل اندام'' میں جو ۱۰۸۱ھ کی تصنیف ہے وجہی کو مرحوم ظاہر کر کے اپنے خواب میں آنے کا تذکرہ کیا ہے۔ جیسا کہ تذکرہ کیا جا چکا ہے وجہی اپنے زمانہ کا بڑا شاعر اور نثر نگار تھا۔ فارسی شاعری میں وجہی کی استعداد کا اندازہ اس کے اس دیوان سے ہوتا ہے جو سالار جنگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ وجہی کی اردو شاعری کا کوئی دیوان تو دَست یاب نہیں ہوا ہے لیکن محققین نے اس کے اردو شاعری کے جو نمونے تلاش کیے ہیں ان کی تفصیل ڈاکٹر گیان چند جین نے تاریخ ادب اُردو جلد سوم ص ۳۴۶ تا ۳۴۸ میں بیان کی ہے۔ مختصراً وہ اس طرح ہے۔

﴿۱﴾ مثنوی قطب مشتری ﴿۲﴾ ۱۴ر غزلیں ﴿۳﴾ ۱۰ر رباعیاں ﴿۴﴾ ۲ر مرثیے

''سب رس''، وجہی کی نثری خدمات میں سب سے اہم کارنامہ ہے جو عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں وجود میں آیا ''سب رس'' میں حسن ودل کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ قصہ طبع زاد نہیں ہے بلکہ فارسی سے ماخوذ ہے لیکن وجہی کے تمثیلی اسلوب اور انشا پردازی کی دل کشی نے اس میں بڑی دل چسپی پیدا کر دی ہے۔ ''سب رس'' کی نثر پُر تکلف اور مرصّع نگاری کا ایسا نمونہ ہے جس کی مثال ''سب رس'' سے پہلے کہیں اور نہیں ملتی۔ ''سب رس'' کے علاوہ وجہی کی ایک اور تصنیف ''تاج الحقائق'' بھی ہے اس میں اخلاق وتصوف پر مباحث ہیں لیکن اس میں نثر کی وہ خوبیاں اور خصوصیات نظر نہیں آتیں جو ''سب رس'' کی نثر میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔

05.04 قطب مشتری کا تعارف

''قطب مشتری'' تقریباً ۱۹۹۷ر اشعار پر مشتمل مثنوی ہے اس کے علاوہ اس میں ۸ر غزلیں اور ۹ر رباعیاں بھی شامل ہیں۔ مثنوی ۱۰۱۸ھ میں لکھی گئی تھی اور وجہی نے بارہ دنوں میں اس کی تکمیل کی تھی جس کا ثبوت خاتمہ کے آخری شعر سے ملتا ہے اس میں وجہی نے کہا ہے۔

تمام اِس کیا دیس بارہ منے سنہ یک ہزار ہور اٹھارہ منے

مثنوی کی تصنیف کے زمانہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کا تیسرا بیٹا محمد قلی قطب شاہ تخت نشین تھا، مثنوی اس کے انتقال سے دو سال قبل لکھی گئی تھی۔ مثنوی کی تصنیف کے سلسلہ میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ وجہی نے مثنوی محمد قلی

قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی تھی اور کسی تقریب میں پیش کی تھی اگر چہ ان امکانات کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا لیکن وجہی نے مثنوی میں اس کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ خاتمہ میں اس نے مثنوی کو خود کا نام دنیا میں روشن کرنے کا ذریعہ کہا ہے وہ کہتا ہے۔

قطب مشتری میں جو بولیا کتاب سو ہوئی جگ میں روشن کہ جیوں آفتاب
اول ہور آخر کے کاماں پچھان دنیا میں رکھیا ہوں میں اپنا نشان
نشانی رکھے باج چارا نہیں کہ دائم کوئی رہنہارا نہیں

''قطب مشتری'' کی اِبتدا رواج کے مطابق حمد سے کی گئی ہے۔ حمد میں ۳۷/اشعار کے بعد ۲۷ اشعار میں مناجات کی گئی ہے اس کے بعد نعت میں ۲۶/اشعار کہے گیے ہیں اور اس کے بعد ۳۴/اشعار میں معراج کا ذکر کیا گیا ہے اسی کے بعد منقبت ہے جو ۴۹/اشعار پر مشتمل ہے اس کے بعد نو ۹/اشعار میں عشق کی اہمیت واضح کی گئی ہے اس میں گل سے بلبل کے، پتنگے کے شمع سے، چکور کے چاند سے، مجنوں کے لیلیٰ سے، زلیخا کے حضرت یوسف سے اور ایاز کے محمود سے عشق کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے۔

اِسی عشق تے عاشق ہے سرفراز پچھیں یا حقیقت اچھو یا مجاز

عشق کی اہمیت وعظمت کے بیان کے بعد مثنوی میں وجہی نے ۳۷/اشعار میں شاعری کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے اس کی فنّی بصیرت اور تنقیدی صلاحیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے اور شاعری کے بارے میں اس کے نظریات سامنے آتے ہیں۔ اسی کے بعد وجہی نے ۲۳/اشعار میں اپنی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں۔

05.05 قطب مشتری کا جائزہ

داستان کا آغاز شہنشاہ کی مدح سے ہوتا ہے۔ شہنشاہ کا نام ابراہیم قطب شاہ ہے اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ مدح کے ممدوح محمد قلی قطب شاہ کے والد ابراہیم قطب شاہ ہیں۔ وجہی کے ذہن میں در پردہ سلطان ابراہیم قطب شاہ ہو سکتے ہیں۔ اس کا احتمال اس لئے اور زیادہ ہے کہ ابراہیم قطب شاہ محمد قلی قطب شاہ کے والد تھے اور مثنوی قلی قطب شاہ کے عہد میں لکھی جا رہی تھی لیکن جس زمانہ میں یہ مثنوی لکھی گئی ابراہیم قطب شاہ کی وفات ہو چکی تھی۔ مدح اور ممدوح زمانہ حال سے تعلق رکھتا ہے ملاحظہ ہو۔

جتے بادشاہاں ہیں سنسار کے بھکاری ہیں سب اُس کے دربار کے

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممدوح ابراہیم قطب شاہ گولکنڈہ کا سابق سلطان نہیں بلکہ مثنوی کے ہیرو کا باپ ہے۔

مثنوی ''قطب مشتری'' کا قصہ ایک عشقیہ قصہ ہے جس میں حسب روایات بادشاہِ وقت جو بڑا جود وسخا اور عدل وانصاف کا مالک تھا اولاد نہ ہونے کے غم میں مبتلا تھا اس کے یہاں بڑی منّتوں اور مرادوں کے بعد ایک فرزند ہوا وہ انتہائی حسین وجمیل اور خوب صورت تھا۔ اس کی پرورش بڑے ناز ونعم سے کی گئی اور اسے ہر فن میں ماہر بنانے کے لئے اس کی تعلیم وتربیت پر پوری توجہ دی گئی۔ شہزادہ خود انتہائی ذہین اور ہوشیار تھا بہت جلد تمام علوم وفنون میں ماہر ہو گیا اور جب جوان ہوا تو ہر میدان میں یکتائے زمانہ ہو گیا ایک رات جب ایک مجلس طرب آراستہ کی گئی تھی تو وہاں شہزادے کی آنکھ لگ گئی اور عالم خواب میں اس نے ایک پیکر جمال حسینہ کو دیکھا۔ بیدار ہونے پر وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا اور بے چین وبے قرار رہنے لگا۔ ماں باپ کو جب اس کی پریشان حالی کا سبب معلوم ہوا تو وہ فکر مند ہو گیے۔

اوراس کی تسکین کے خاطر نازنینوں کی محفل آراستہ کی لیکن شہزادے کی جس کا نام محمد قلی قطب شاہ تھا بے چینی، بے قراری کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ آخر کار اس سلسلہ میں ایک شخص جس کا نام عطارد تھا اور جو:

عجب ایک اُس وقت پر مرد تھا ہنروند، عاقل، جہاں گرد تھا
دنیا کے اپیں بندتے آزاد ہو پھرے شرق تے غرب لگ باد ہو

اس سے مشورہ کیا گیا تو اس نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ قلی قطب شاہ نے خواب میں جس نازنین کو دیکھا ہے وہ بنگلہ نگر کی شہزادی مشتری ہے۔ شہزادہ یہ سن کر بے چین ہو گیا اور اس کا دیدار کرنے کے لئے آمادۂ سفر ہوا۔ بڑے ساز وسامان اور رفقاء کے ساتھ عطارد کی رہبری میں منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک زبردست اژدھے اور ایک خوفناک دیو سے مقابلہ ہوا۔ دونوں معرکوں میں شہزادے کو کامیابی حاصل ہوئی۔ دیو کے مسکن میں حلب کے شاہ سرطان کے پردھان اسد خان کا اکلوتا بیٹا جس کا نام مریخ تھا اس سے ملاقات ہوئی۔ مریخ خان بھی بنگالے کی شہزادی زہرا کے عشق میں گرفتار تھا اور اس کی تلاش کے دوران میں دیو کا قیدی بن گیا تھا۔ دیو کے مرنے کے بعد وہ بھی آزاد ہو کر قلی قطب شاہ کے ہم راہ ہو گیا۔

سفر کے دوران میں وہ ایک دل کش باغ میں پہنچے جو پریوں کا مسکن تھا یہاں شہزادے کی ملاقات مہتاب پری سے ہوئی جو دیو کی زیادتی سے پریشان تھی جب شہزادہ نے اسے دیو کے مارنے کی خبر دی تو وہ شہزادے کی ممنون ہوئی اور اس نے شہزادے کو اپنے یہاں قیام پر آمادہ کر لیا لیکن عطارد نے یہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور تنہا بنگلہ نگر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے فن کے کمال سے اتنی شہرت حاصل کی کہ شہزادی نے اسے اپنے محل کی آرائش کا کام سپرد کر دیا۔ عطارد نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر در و دیوار پر نقوش بناتے ہوئے انہیں کے درمیان شہزادے کی تصویر بنا دی، جب مشتری کی نظر اس تصویر پر پڑی تو وہ صاحبِ تصویر پر فریفتہ ہو گئی۔ عطارد نے دونوں کی ملاقات کا انتظام کیا۔ شہزادے نے مشتری کو دکن چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اسی درمیان دونوں نے مریخ اور زہرا کا عقد کروا دیا اور انہیں بنگلہ نگر کی سلطنت سونپ دی۔ دکن پہنچنے پر قطب شاہ اور مشتری کا شان دار استقبال کیا گیا۔ ابراہیم قطب شاہ نے ایک شان دار تقریب منعقد کی اور شہزادے کو سلطنت کی باگ ڈور سونپ دی۔ قطب شاہ اور مشتری نے اطمینان کی سانس لی اور دادِ عیش دینے لگے۔

''قطب مشتری'' کا قصہ پرانے انداز کا ہے۔ اس میں خاص دل چسپی اور دل کشی نظر نہیں آتی۔ ''قطب مشتری'' کے قصہ میں ابراہیم قطب شاہ، قلی قطب شاہ اور مشتری کے کرداروں سے یہ غلط فہمی بھی پیدا ہوتی ہے کہ قطب مشتری کا قصہ سلطان قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستانِ عشق پر مبنی ہے لیکن ''قطب مشتری'' کا بغور مطالعہ کرنے اور ابراہیم قطب شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لینے پر یہ غلط فہمی ختم ہو جاتی ہے۔ تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم قطب شاہ کی وفات ۹۸۸ھ میں ہو گئی تھی اور اس وقت تاریخ فرشتہ کے مطابق محمد قلی قطب شاہ کی عمر بارہ سال اور دیگر تاریخوں کے مطابق پندرہ سال کے قریب تھی یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ قلی قطب شاہ منتوں اور مرادوں سے پیدا نہیں ہوا تھا۔ ابراہیم قطب شاہ کی ۳۰/ اولادیں ہوئیں تھیں۔ جن میں سے ۶/ فرزند اور ۱۳/ لڑکیاں سنِ بلوغ کو پہنچیں۔ فرزندان میں دو بھائی محمد قلی سے بڑے تھے لیکن ابراہیم قطب شاہ نے اس کی صلاحیتوں کی بنا پر اس کی جاں نشینی کی وصیت کر دی تھی۔ وجہی کی قطب مشتری کے مطابق ابراہیم قطب شاہ اپنی زندگی میں اسے تخت و تاج نہیں سونپا تھا۔

ایسے اور بہت سے تاریخی واقعات ہیں جن کے جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ قطب مشتری کے قصہ کا حقائق سے کوئی واسطہ نہیں ہے یہ تخیلی قصہ ہے۔اس سلسلہ میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''جب ہم قطب مشتری کے قصّے کے اجزاء اور اس کے ماخذ کے بارے میں غور کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وجہی نے پلاٹ کی تعمیر وتشکیل میں بعض لوک کہانیوں کے اجزاء کو مربوط کر کے ان سے اپنے پلاٹ کا تانا بانا تیار کیا ہے۔''

مثنوی ''قطبِ مشتری'' میں قصہ کی طرح پلاٹ کی ترتیب میں بھی فن کاری کا فقدان ہے پلاٹ کے قصہ کے اِرتقا میں نہ کوئی پیچیدگی ہے نہ کسی قسم کا اُلجھاؤ ہے، واقعات کے بیان میں بھی نہ کوئی حیرت وتعجب ہے نہ اثر انگیزی وتازگی۔شہزادہ کی پیدائش سے لے کر اس کے سلطنت کی ذمہ داریاں حاصل کرنے کے واقعات اگرچہ مسلسل ہیں لیکن ان میں تحریک کی کمی اور ایک قسم کا سپاٹ پن ہے۔جب قلی قطب شاہ روانہ ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک بڑا قافلہ تھا لیکن بعد میں اس کا کوئی نشان ہی نہیں ملتا۔مثنوی میں مافوق الفطرت عناصر کی موجودگی پلاٹ میں کوئی خاص دل چسپی پیدا نہیں کرتی اور ان کے نکال دینے سے پلاٹ پر کوئی اثر نہیں پڑتا مثنوی میں مہتاب اور مریخ خاں کے قصّہ غیر ضروری معلوم ہوتے ہیں۔مشتری اور زہرا صرف شہزادیاں ہیں ان کے ماں باپ اور ان سے متعلق دوسرے اہلِ خاندان کا کہیں پتہ نہیں ملتا پلاٹ میں مافوق الفطرت عناصر کی تصاویر نامکمل ہیں ان سے طلسماتی فضا پیدا کرنے میں مثنوی نگار کامیاب نہیں ہوسکا ہے وہ اژدہا اور دیو کو ہیبت اور جلال کا نمونہ بنا کر پیش کرتا ہے لیکن جب وہ شہزادے کے سامنے آتے ہیں تو ان کی ہیبت اور جلال کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور وہ معمولی مخلوق بن کر رہ جاتے ہیں اور شہزادہ کی ایک ہی ضرب میں دم توڑ دیتے ہیں جب کہ شہزادہ کوئی مافوق الفطرت قوت کا استعمال نہیں کرتا خود شہزادہ اپنے عمل میں ہر جگہ عطارد کی فہم وفراست اور اس کے عمل کا رہین منت نظر آتا ہے اور اس کی کوششوں کے سہارے ہی کامیابی حاصل کرتا ہے۔

مثنوی میں مشتری کی تلاش کے دوران راستے میں شہزادہ کا چمن میں پہنچنا وہاں پریوں کی موجودگی اور مہتاب سے ملاقات قصہ میں بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں۔قطب مشتری میں عشقیہ معاملات میں بھی روایتی عشق کا آغاز محبوب کو دیکھ کر یا اس کی تصویر دیکھ کر ہوتا ہے کوئی اثر انگیز واقعہ یا حادثہ یا کارنامہ اس کا محرک نہیں بنتا جس کی وجہ سے یہ لگاؤ غیر فطری معلوم ہوتا ہے اس کا ثبوت اس وقت بھی ملتا ہے جب مثنوی نگار مہتاب سے شہزادے کے رشتہ کو بہن بھائی کے رشتے میں تبدیل کر دیتا ہے۔مثنوی کے پلاٹ میں وجہی کے ناصحانہ انداز نے اس کی فضا کو بڑا خشک بنا دیا ہے۔تہذیب ومعاشرت کے مرقعوں سے پلاٹ میں اثر انگیزی اور دل چسپی پیدا ہوتی ہے لیکن ''قطب مشتری'' کا پلاٹ میں تہذیب ومعاشرت کی تفصیلات کے بیانات بھی نہیں ہیں اور اس دور کے تہذیبی حالات اور معاشرتی معاملات نیز رسوم وعقائد کی تصویر کشی سے پلاٹ محروم ہے جیسا کہ مثنوی کے پلاٹ میں خیر وشر کے معاملات پیش کرنے کی کوشش ضرور ہے لیکن ان کے درمیان تصادم میں زور اثر کا فقدان ہے اور ناصحانہ رنگ حاوی ہے۔مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ''قطب مشتری'' کا پلاٹ ایک کمزور پلاٹ ہے۔مثنوی ''قطبِ مشتری'' میں کرداروں کی تعداد اچھی خاصی ہونے کے باوجود وجہی کوئی ناقابلِ فراموش کردار تخلیق کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے قطب مشتری میں وجہی نے کرداروں کو حقیقت سے قریب کرنے کے بجائے ان میں مبالغہ آمیز صفات پیدا کرنے کی کوشش میں کردار نگاری کو بوجھل بنا دیا ہے۔مثنوی

کے اہم کرداروں میں مثنوی کے ہیرو اور ہیروئن کے علاوہ ہیرو کا باپ ابراہیم قطب شاہ، عطارد، مہتاب پری، مریخ خاں، ہیروئن کی بہن زہرا، ہیروئن کی دائی، مہتاب پری کی داسی سلکھن پری شامل ہیں۔

مثنوی کے ہیرو قطب شاہ کی رعایت سے کرداروں کے نام مشتری، زہرا، مہتاب، عطارد، مریخ خان، اسد خاں، شاہ سرطان وغیرہ سیاروں کے نام پر رکھے گیے ہیں۔ بظاہر یہ سارے اجرامِ فلکی قطب شاہ کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں لیکن جب خود قطب گردش میں ہوتا ہے تو نظام درہم برہم نظر آتا ہے اور عطارد کی مدد سے ہی اس میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

مثنوی میں مرکزی کردار ہیرو قلی قطب شاہ کا ہے اس کے گرد ہی مثنوی کا پلاٹ بُنا گیا ہے اور اسے نہایت حسین و جمیل اور خاص انسانی صفات جیسے شجاعت، دلیری، ہمت و حوصلہ، عدل، سخاوت، قوت و طاقت اور علم وغیرہ میں یکتائے زمانہ بتایا گیا ہے۔ مثلاً:

یتا زور تھا اُس کے یک دَست سوں اُچاکر پچھاڑے متے ہست کو
تِرا عدل ایسا ہے اے جگ ادھار کہ آگ ہور پانی اچھے ایک ٹھار

مثنوی میں ہیرو کی جن صفات کا بیان کیا گیا ہے کہانی میں اس کے مظاہرے بہت کم نظر آتے ہیں جیسے شجاعت اور دلیری کے سلسلہ میں وہ کوئی بڑا معرکہ سر نہیں کرتا اژدہے اور دیو کو ہلاک کرنے میں اس کی ذاتی دلیری اور قوت کے بجائے مذہبی قوت کارفرما رہی۔ جہاں تک حکمت، تدبر اور فراست کا معاملہ ہے ان کا عملی ثبوت بھی نہیں ملتا کیوں کہ اس کے زیادہ تر معاملات اور مسائل عطارد کی دانش مندی اور دور اندیشی سے حل ہوئے ہیں جہاں تک سخاوت اور دریادِلی کا تعلق ہے عطارد سے مشتری کی تصویر پا کر اسے سر سے پاؤں تک سونے میں غرق کر دینے اور بنگلہ نگر کی حکومت مریخ و زہرا کو بخش دینے میں سخات کا پہلو ضرور ہے لیکن ان اعمال میں سے پہلا اس کے ذاتی مفاد کا بدلہ تھا اور دوسرا اس کی مجبوری کہ اسے مشتری کو لے کر جلدی اپنے وطن جانا تھا۔ ہاں اس کی سیرت کے بعض پہلو ضرور اس کے کردار کی اہمیت کو نمایاں کرتے ہیں ایک تو ماں باپ کی فرماں برداری دوسرا مہتاب جیسی پری سے گریز اس کے علاوہ حب الوطنی اور وطن دوستی بھی اس کی صفت ہے جس کے تحت وہ دکن کے بارے میں کہتا ہے:

دکھن ہے نگینہ ، انگوٹھی ہے جگ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ ہے لگ
دکھن ملک کوں دَھن عجب راج ہے کہ سب ملک سَر ہور دکھن تاج ہے

مثنوی کی ہیروئن مشتری روایتی ہیروئنوں کی طرح حسن و جمال میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کی پاک دامنی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

جو دَھن پاک دامن وو بے عیب تھی یکا یک سو اُس وقت پر غیب تھی

لیکن جہاں تک فہم و فراست کا تعلق ہے اس سلسلہ میں وہ اپنی دائی پر منحصر تھی اور اسے بعد میں عطارد کا سہارا لینا پڑا اس کے کردار کی خوبیوں میں ایثار و وفا پرستی، وسیع القلبی اور اہلِ فن کی قدر دانی و ثابت قدمی وغیرہ ہیں، شہزادے کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بنگلہ نگر جیسی خوشحال سلطنت سے دستبردار ہو کر اسے زہرا اور مریخ خاں کو سونپ دینا اس کی مذکورہ بالا صفات کو ثابت کرتی ہیں جب شہزادہ اس سے کہتا ہے:

تجے میں وہاں دیوں گا ہاں اے نار! سو اِس دَھات کے شہر ہزاراں ہزار

تو مشتری جواب میں کہتی ہے:

کہی شاہ جو بی تماری خوشی تماری خوشی سو ہماری خوشی
کتا مال ہور ملک دِکھلاے گا ملک مالک تے کیا منجے آئے گا
غرض ہے مُرا تج سوں اے شہ فہیم! نہ کر ایسی باتاں سوں توں دل دو نیم

اس جواب سے مشتری کے کردار کی صفات کا پتہ چلتا ہے اور وہ ایک باوقار شہزادی کے روپ میں سامنے آتی ہے۔

قطب مشتری کے دوسرے نسوانی کرداروں میں مہتاب پری اور زہرا میں مہتاب پری کا کردار اس کی اخلاص، مروت اور وفا پرستی کے ساتھ اس کی وسیع القلبی اور صبر وضبط کی بنا پر متاثر کرتا ہے اور قاری کی ہم دردی حاصل کر لیتا ہے لیکن زہرا کا کردار بالکل بے جان ہے۔ نچلے طبقہ سے تعلق رکھنے والے دوسرے نسوانی کردار سلکھن پری اور مشتری کی دائی کے کرداروں میں وجہی کی کردار نگاری کی بعض خصوصیات نظر آتی ہیں اور اس طبقہ کی خواتین کی خصوصیات سے وجہی کی آگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نسوانی کرداروں سے قطعِ نظر ''قطب مشتری'' کے کرداروں میں سب سے جان دار کردار عطارد کا ہے جو سب سے زیادہ باعمل، ہوشیار، دوراندیش، تجربہ کار، خوش طبع، حاضر دماغ اور معاملہ فہم انسان کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ وہ اپنی فن کی صلاحیتوں اپنے مشوروں اپنی تدابیر اور اپنی کوششوں سے مثنوی کی کہانی کو آگے بڑھاتا، وہ شہزادے کو کامیابیوں اور کامرانیوں سے ہمکنار کرتا اور اس کی آرزو کو پورا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

سب سے پہلے وہی شہزادہ کو مشتری کی تصویر دکھا کر اس کا پتہ بتلاتا ہے۔ اور جب شہزادہ اپنی طبیعت کی عجلت پسندی کے سبب فوراً بنگالہ جانے کا قصد کرتا ہے تو وہ اسے دشواریوں سے آگاہ کرتا ہے لیکن اس کے اس عمل پر جب شہزادہ برہم ہو جاتا ہے تو وہ یہ جواز پیش کر دیتا ہے کہ میں تو تیرے جذبہ کی صداقت کو آزما رہا تھا اور پھر کہتا ہے کہ یہ تو بہت آسان کام ہے اس واقعہ سے عطارد کی موقع شناسی اور سمجھ داری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ سفر کے دوران میں مہتاب کے چمن تک وہ قدم قدم پر اپنی سوجھ بوجھ، اپنی معلومات اور اپنی دوراندیشی کا ثبوت دیتا ہے اسی کے بعد شہزادہ کو مہتاب پری کے ساتھ چھوڑ اس کا تنہا بنگالہ روانہ ہونا اس کی دوراندیشی اور فہم وفراست کا ثبوت ہے۔ بنگالہ پہنچ کر بھی اس نے کسی عجلت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے بڑے تحمل سے کام لیا اور اپنے فن مصوّری کو اپنے مقصد کا ذریعہ بنا کر مشتری کے محل تک رسائی حاصل کر لی اور وہاں فن کے وسیلہ سے مشتری کو شہزادے کا دیوانہ بنا دیا۔ عطارد مشتری کے شہزادے پر فریفتہ ہونے کے بعد بھی یہ راز رکھتا ہے کہ شہزادہ بھی اس کا عاشق ہے بلکہ وہ شہزادہ کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتا ہے اس طرح وہ آتشِ شوق کو بھڑکا کر انسانی نفسیات سے اپنی آگاہی کا ثبوت دیتا ہے:

جو عاجز ہو دِکھلائے عاشق نیاز تو معشوق کرتا ہے تیڑ تیج ناز
کہ خوباں میں عادت سو اِس دھات ہے چھپی نیں، ہے مشہور یو بات ہے

غرض یہ کہ قطب مشتری میں عطارد ہی ایک ایسا کردار ہے جس کی صفات نے وجہی کی کردار نگاری کا بھرم رکھ لیا ہے ورنہ دوسرے کرداروں میں کردار نگاری کمزور نظر آتی ہے۔ قطب مشتری میں سراپا نگاری میں اگرچہ بعض کمزوریاں ہیں لیکن ان کے باوجود سراپا نگاری میں اس نے اپنی تخیل آفرینی باریک بینی اور مقامی چیزوں سے گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے مثلاً شہزادے کے سراپے میں اس نے اسے سر سے

مشابہ اور صورت میں یوسف سے زیادہ حسین قرار دیا ہے تو محبوب کے چہرے کو کنول کے پھول سے تشبیہ دی ہے اور اس کی متحرک آنکھوں کو مچھلیوں سے تشبیہ دی ہے اسی طرح اس کی چہرہ پر لہراتی ہوئی زلفوں کو سانپ سے تشبیہ دی ہے اور محبوب کے کان کے زیور کو پھول سے اور تلک کو موتیوں کی لڑی سے تشبیہ دی گئی ہے شہزادے کے سراپے کے بیان میں وہ کہتا ہے:

بدن سیم قد ، سَرو جیوں راست ہے کہ صورت میں یوسف تے کیں زیاست ہے

اسی طرح سراپا نگاری کی خصوصیات دوسرے کرداروں کی تصویروں میں بھی نظر آتی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

چنچل نین یو دَھن کے نیں ٹھارتے کہ شاطیر شہ کے تلنگ مارتے

سو دَھن کے تن اُوپر دِسے یوں گوہر کہ بیٹھے ہیں جگنے مگر سرو پر

مثنوی کی کامیابی میں جذبات نگاری کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ جذبات کی نوعیت اور کیفیت الگ ہوتی ہے اس کے علاوہ بہت سے جذبات ایسے ہوتے ہیں جن کے درمیان بہت نازک سا فرق ہوتا ہے۔ انسان کے ماحول، اس کے مزاج، اس کے عادات وخصائل، اس کے مقامات مراتب یہ تمام چیزیں اس کے جذبات پر اثر انداز ہوتی ہیں ان تمام باتوں کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ جذبات نگاری ایک نہایت دشوار اور نازک فن ہے اس سلسلہ میں قطب مشتری کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ قطبِ مشتری کی جذبات نگاری اگر چہ دوسری مقبول مثنویات کے معیار کو تو نہیں پہنچتی لیکن اس کے باوجود انسانی جذبات کی نوعیت اور کیفیت سے وجہی کی آگاہی اور انسانی نفسیات سے اس کی واقفیت کا ثبوت دیتی ہے۔ مثلاً شہزادہ جب عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے وجہی کہتے ہیں:

کدھیں چُکہ ہنسے ہور کدھیں چُکہ روئے کدھیں سُدّ پاوے، کدھیں سُد کھولے

شہزادے کی بے چینی اور بے قراری کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:

پریشان، حیران، بے تاب تھا نہ کچ اُس کوں آرام نا خواب تھا

اسی طرح شہزادے کی تصویر دیکھ کر مشتری کی جو کیفیت ہوئی اس کی تصویر کشی اس طرح کی گئی ہے:

دیک اُس نقش کوں نار حیران تھی سو سُدبُد گنوا سب پریشان تھی

نہ اَن بھاوَتا تھا نہ پانی اُسے ہوی تلخ سب زندگانی اُسے

شہزادی کی اس حالت پر اس کی دائی کے جذبات ملاحظہ ہوں:

کہاں جاؤں؟ کس کو کہوں؟ کیا کروں؟ اِتال اِس کوں اِس ٹھار میں کیوں دھروں؟

قطب مشتری میں وجہی نے شہزادہ کے فراق میں مشتری کے جذبات کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ان کی جذبات نگاری کی خصوصیات کی مثال ہے۔ چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

نہ سُکھ سوں منے نیند آتی اَہے نہ پھُل سیج رِی منج بھاتی اَہے

نہ منج دیس ہے سُکھ، ناں منج رات نہ جانوں کہ گمتا ہے شہ کس سنگات

اس کے علاوہ شہزادہ کا مشتری کو خواب میں دیکھنے کے بعد کی حالت کا بیان اس کی پریشانی پر ماں باپ کی فکرمندی اور شہزادہ کو دیکھ کر مہتاب پری کی کیفیت کا بیان جذبات نگاری کی اچھی مثالیں ہیں شہزادہ کو دیکھ کر مہتاب پری کی کیفیت کا اندازہ درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

سو مہتاب دیکھ شہ کوں بے تاب ہوئی　　محبت سوں گل جیوں وو گلاب ہوئی
پڑی مست ہو یوں وو یک ڈگ منے　　کہ اُٹھنے کی طاقت نہ تھی اُس منے

مثنوی قطب مشتری میں منظر نگاری کے نمونے اگر چہ زیادہ نہیں ہیں اثر دہے اور دیو کے مسکن میں اگر چہ منظر نگاری کے مواقع تھے لیکن وجہی نے مہتاب پری کے باغ میں ہی منظر نگاری پر خاص توجہ دی ہے۔ اور مناظر فطرت کے تحت باغ کی دل کشی، درختوں کی شادابی، پھولوں کی طراوٹ، پرندوں کی چہچہاہٹ، فواروں کی جھلملاہٹ بھنوروں کی بھنبھناہٹ کا بیان بڑے دل کش انداز میں کیا ہے۔

یہاں مثال کے لئے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

یکا یک دِسیا ایک نزدیک باغ　　ہوا اُس کی باساں تے تَر سب دماغ
بنفشہ، مشک پائی تھی بال میں　　سرو رقص کرتے تھے آ حال میں
سروداں سو مرغاں کے نالے تھے واں　　صریاں کلیاں پھول پیالے تھے واں
برگ بار آئے ہیں اِس دھات سب　　کہ چھپ گئے پھلاں کے تلیں پات سب
یکستی چمن ایک مقبول ہیں　　کہ بھونرے پتنگ ہور دیوے پھول ہیں

﴿۱﴾ معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی:۔ کسی بھی مثنوی کا ایک اہم پہلو اس میں پیش کی گئی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی عکاسی ہوتا ہے۔ اس روشنی میں مثنوی قطبِ مشتری کا جائزہ لینے پر اندازہ ہوتا ہے کہ قطبِ مشتری دبستان دہلی کی مثنوی سحرالبیان کے مرتبہ تک تو نہیں پہنچتی لیکن اس میں جابجا اس زمانے کے خواص وعوام کی طرزِ زندگی، رہن سہن کے طریقوں اور معاشرتی آداب کی عکاسی اور مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں حکمراں طبقہ کے سلسلہ میں پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کے اوصاف میں شجاعت، سخاوت، سپہ گری، تدبر اور رعایا پروری ضروری خیال کی جاتی تھی، درباروں میں اکابر سلطنت کے علاوہ مختلف علوم وفنون کے ماہرین کی اہمیت تھی۔ رمال اور نجومی بھی بڑی اہمیت رکھتے تھے ہندو تہذیب کے اثرات کے تحت علم جیوتش پر اعتماد کیا جاتا تھا جنم کنڈلی بنوائی جاتی تھی تو فال بھی نکالے جاتے تھے۔ بادشاہِ وقت کے احترام میں سجدہ کیا جاتا تھا۔ جشنِ طرب کا رواج عام تھا۔ ان کے لئے سازندے، مطرب اور رقاصائیں ملازم رکھی جاتی تھیں۔ محلات میں دودھ پلانے اور بچوں کی نگہداشت کے لئے دائیاں رکھی جاتی تھیں۔ دائیوں کو قدر وعزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مشتری کے سن بلوغ پر پہنچنے کے بعد بھی مہروان دائی اس کی ہمدم ہمراز اور مددگار ومعاون تھی۔

شہزادوں کو فنون سپہ گری میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ دوسرے علوم وفنون میں ماہر بنانے کے لئے اساتذہ اور معلّموں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ محلوں کی سجاوٹ اور آرائش پر توجہ دی جاتی تھی، دل بہلانے کے لئے رقص وسرود کی محفلیں منعقد کرنا عام تھا۔ مجالس ومحافل میں خوب صورت دوشیزاؤں کی کثرت ہوتی تھی۔ محفلوں کو آراستہ کرنے کے لئے چراغاں کیا جاتا تھا۔ سفر پر روانگی کے وقت خدا کے سپرد کیا جاتا اور حفاظت کے لئے دعائیں پڑھی جاتی تھیں۔ پردہ کی رسم عام تھی۔ شادی کے بعد دلہن کے جلوہ کی رسم ہوتی تھی شراب عام

تھی، بادشاہ وقت اور شہزادے بلاتکلف اس کا استعمال کرتے تھے۔محلوں کے اندر آراستگی نقش ونگار سے کی جاتی تھی تو بیرونی آراستگی کے لیے باغات لگائے جاتے تھے ان میں نہریں اور فوّارے ہوتے تھے اور قسم قسم کے پھولوں کے پودوں سے ان کی فضا کو خوشگوار بنایا جاتا تھا۔قطب مشتری میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جن سے اس زمانے کی طرزِ زندگی، معاشرتی معاملات اور تہذیبی قدروں کا پتہ چلتا ہے۔

﴿۲﴾قطب مشتری کی شعری خصوصیات: مثنوی کے ابتدائی حصہ میں وجہی نے شعروسخن کے بارے میں اپنے نظریات نظم کیے ہیں ان سے وجہی کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے اس نے شعر کی سب سے اہم خوبی سلاست کو قرار دیا ہے وہ کہتا ہے:

سلاست نہیں جس کیرے بات میں پڑیا جائے کیوں جز لے کر بات میں

اس کے علاوہ وہ بات کو بلاوجہ طول دینے اور نظم میں غیر ضروری باتیں بیان کرنے کو خامی تصور کرتا ہے اور ربط وتسلسل کے ساتھ اختصار کو نظم کی خوبی تصوّر کرتا ہے ذیل کے اشعار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے:

جو بے ربط بولے تُو بیتاں پچیس بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

نکو کر تُوں لئی بولنے کا ہوس اگر خوب بولے تو یک بیت بس

مواد اور ہیئت کے بارے میں بھی اس کا خیال ہے کہ لفظ اور معنی کو ایک جان ہونا چاہیے۔معنی بلند ہوں اور الفاظ بھی موزوں اور مناسب ہوں اسی سے شاعری میں اثر انگیزی اور معنویت پیدا ہوتی ہے وہ کہتا ہے:

وو کچ شعر کے فن میں مشکل اچھے کہ لفظ ہور معنی یو سب مل اچھے

اگر فام ہے شعر کا تجکوں چھند چنے لفظ لیا ہور معنی بلند

وجہی شعر کا اصل حسن اس کے اعلیٰ معنی کو قرار دیتا ہے اس کے خیال میں اس کی ظاہری ہیئت کو سنوار کر نورٌ علی نور بنایا جاسکتا ہے:

اگر خوب محبوب جیوں سُور ہے سنوارے تو نور علیٰ نور ہے

وجہی کے نزدیک نقالی یا تقلید فن کاری نہیں ہے بلکہ اصل فن کاری تخلیق کرنے میں مضمر ہے:

ہنروند اُس کوں کھیا جائے گا جکوئی اپنے دل تے نَوا لیائے گا

اس کے نزدیک شعر کی اصل خوبی اس کی صداقت اور اثر انگیزی میں پوشیدہ ہوتی ہے وہی شعر اعلیٰ ہوتا ہے جس کی صداقت پر دل گواہی دیتا ہے:

سخن گو وہی جس کی گفتار تھے اُچھل کر پڑے آدمی ٹھار تھے

وجہی کہتا ہے کہ شعر کے پست وبلند کا اندازہ کرنے اور اچھے بُرے میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہر شخص میں موجود نہیں ہوتی۔جوہر کی حقیقی قدر وقیمت صرف جوہری ہی سمجھ سکتا ہے:

جہاں پاچ اچھے گا وہاں کاچ کیا جہاں دودھ اچھے گا وہاں چھاچ کیا

نہ یو بات ہر ایک کے سات ہے جکوئی عارف ہے اُس سوں یو بات ہے

قطب مشتری میں وجہی نے شاعری کی خصوصیات پر اظہار خیال کرنے کے ساتھ ساتھ نقاد جسے دکن میں عارف کہا گیا ہے اس کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ناقد یا عارف کا غیر جانب دار، راست گو اور انصاف پسند ہونا لازمی ہے نقاد کے محاکمہ بے لاگ اور اس کی رائے درست اور قطعی ہونا چاہیے۔ قطب مشتری میں وجہی کے شاعری اور ناقد کے بارے میں مذکورہ خیالات سے وجہی کی ناقدانہ بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور اس کے زمانے میں شعر کے حسن و قبح کا معیار بھی سامنے آتا ہے۔

قطب مشتری کے جائزہ میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مثنوی میں وجہی نے جو ادبی تصورات پیش کیے ہیں مثنوی میں ان پر عمل کیا ہے۔ مثنوی میں اس نے غیر ضروری طوالت سے پرہیز کیا ہے۔ اور اشعار میں برمحل اور مناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

''مثنوی قطب مشتری میں وجہی نے اپنے ادبی تصورات کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے وہ شعرا کو اپنا کلام سنوارنے اور اس کے حسن و دل فریبی میں اضافہ کرنے کی تلقین کرتا ہے وجہی اس خیال کا حامل ہے کہ شعر میں لفظ و معنی دونوں میں تناسب اور توازن موجود ہے۔''

وجہی نے اپنے ادبی تصورات میں لفظ و معنی کے علاوہ صوری حسن میں اضافہ کرنے کے لئے صنائع بدائع کے استعمال پر بھی زور دیا ہے اس کا خیال ہے کہ اگر خوب صورت محبوب کو سنوارا جائے تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے چنانچہ قطب مشتری میں جا بجا صنائع بدائع کا التزام ملتا ہے مثلاً ذیل کے شعر میں حسن تعلیل کا نمونہ:

اَنبر دان پایا ہے زر بے شمار تو ڈھنڈتا ہے رکھنے کوں دن رات ٹھار

اسی طرح مبالغہ جو قصہ کا نمایاں عنصر ہوتا ہے اور اشعار کے حسن اور تخیل کی آرائش کے لئے ضروری ہوتا ہے اس کی مثالیں قطب مشتری میں جا بجا ملتی ہیں جب وہ شہزادہ محمد قلی قطب شاہ کی ایام طفلی میں طاقت کا بیان کرتا ہے تو کہتا ہے:

یتا زور تھا اُس کے یک دَست سوں اُچاکر پچھاڑے متے ہست کو

وجہی نے قطب مشتری میں تشبیہات اور استعارات سے بھی بڑا کام لیا ہے۔ قطب مشتری کے تقریباً ہر دوسرے شعر میں تشبیہ اور استعارہ کا التزام ملتا ہے اس کے یہاں تشبیہات میں بڑی جدت اور دل کشی اور استعارات میں ندرت نظر آتی ہے۔

تشبیہات کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کلنک چاند میں ہے سو دِستا ہے یوں کہ سینے کی پیالی میں ہے مشک جوں

دِسے تِلی یو نار کی آنک میں کہ بیٹھیا بھنور آنب کی پھانک میں

اسی طرح مہتاب اور شہزادے کی جدائی کے وقت نہایت بلیغ استعارہ کا استعمال کیا گیا ہے:

پُنم چاند جیوں دونو گھٹنے لگے ستارے انکھیاں میں تے ٹٹنے لگے

مثنوی قطب مشتری میں رعایت لفظی کی مثالیں بھی کثرت سے ملتی ہیں اس میں بھی اس نے عربی فارسی الفاظ سے زیادہ مقامی الفاظ سے کام لیا ہے۔ مثنوی قطب مشتری میں جا بجا محاورات اور ضرب الامثال اور تلمیحات کا بھی مناسب استعمال کیا گیا ہے۔

﴿۳﴾ **محاورات وضرب الامثال:۔** ﴿۱﴾ ایک پنت دو کاج ﴿۲﴾ کالا ہے دو جگ میں منہ چور کا ﴿۳﴾ ہوا رام میں دل مرا رام نئیں ﴿۴﴾ بھر سے کرے بھینس کڑا جنی ﴿۵﴾ کہ در پن نجھائے کنگن ہاتھ کا

قطب مشتری میں تلمیحات کا استعمال بھی جا بجا ملتا ہے۔ وجہی نے مثنوی میں سرزمین عرب سے تعلق رکھنے والی تلمیحات مثلاً نوح، آبِ زمزم، موسیٰ، عرش وکرسی، لیلیٰ ومجنوں، لقمان وغیرہ کا ذکر کیا ہے تو دارا، افراسیاب اور جمشید وغیرہ میں ایرانی اثرات قبول کیے ہیں۔ ان کے علاوہ رام، شیام، کرشن اور گوپیوں کا ذکر کر کے ہندوستانی واقعات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ جہاں تک قطب مشتری کی فنّی خوبیوں اور زبان و بیان کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ آج کے دور کے لحاظ سے زبان قدیم اور نامانوس ہے لیکن پوری مثنوی میں ثقیل لفظ نہیں ملتا بلکہ آسان اور سلیس اور موزوں اور مناسب الفاظ کا استعمال کر کے وجہی نے اپنی قدرتِ بیان کا ثبوت دیا ہے اور اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔

مثنوی قطب مشتری کی خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر حمیرا جلیلی لکھتی ہیں:

> ''قطب مشتری شروع سے آخر تک پڑھ ڈالیے کہیں کوئی بوجھل یا ثقیل لفظ نہیں ملتا۔ نادر و اچھوتی تشبیہات واستعارے، جان دار منظر نگاری، انسانی نفسیات اور تمدنی واخلاقی اقدار کا ایک ایسا گلدستہ ہے جس کی دل کشی اور مہک وقت کے ساتھ بڑھتی رہے گی۔''

05.06 خلاصہ

''قطب مشتری'' کا مصنف ملا وجہی ہے۔ وہ اپنے دور کا بڑا انشا نگار اور شاعر تھا اس کے حالاتِ زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس نے قطب شاہی دور کے چار سلاطین کا زمانہ دیکھا تھا۔ مثنوی قطب مشتری اس نے محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں لکھی تھی ''قطب مشتری'' ۱۹۹۷/ اشعار پر مشتمل ہے اس کے علاوہ اس میں آٹھ غزلیں اور نو رباعیاں بھی شامل ہیں۔ مثنوی ۱۰۱۸ھ میں مکمل ہوئی تھی اور بارہ دنوں میں لکھی گئی تھی۔ قطب مشتری کی ابتدا حمد سے ہوئی ہے اس کے بعد مناجات ہے پھر نعت ہے اس کے بعد معراج کا تذکرہ ہے اور پھر منقبت ہے۔ منقبت کے بعد عشق کے جذبے کی اہمیت پر اشعار کہے گیے ہیں۔ اس کے بعد وجہی نے شاعری اور اس کے لوازمات اور ضروریات کا تذکرہ کیا ہے اور شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے اچھے شعر کی خوبیاں نظم کی ہیں اور شاعری میں سلاست ربط وتسلسل، اختصار اور معنی آفرینی کو لازمی قرار دیا ہے۔ بعد میں اس نے اپنی شاعری کی خوبیاں اور خصوصیات بیان کی ہیں۔

اسی کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے یہ ایک عشقیہ قصہ ہے جس میں مثنوی کا ہیرو جس کا نام بادشاہِ وقت کے نام پر محمد قلی قطب شاہ رکھا گیا ہے خواب میں ایک حسین دوشیزہ کو دیکھتا ہے اور اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ نیند سے بیدار ہونے پر وہ انتہائی بے چین اور بے قرار رہتا ہے اور دوشیزہ کے تصور میں ڈوبا رہتا ہے اس کی بے چینی اور بے قراری کو دور کرنے کے لئے اس کا باپ جسے محمد قلی قطب شاہ کے والد ابراہیم قطب شاہ کا نام دیا گیا ہے اور اس کی والدہ طرح طرح کی کوششیں کرتے ہیں۔ حسین دوشیزاؤں کی محفلیں سجاتے ہیں لیکن شاہزادہ کی بے چینی دور نہیں ہوتی اسی دوران میں ایک مصوّر اور نقاش جس کا نام عطارد تھا اور کئی ملکوں کا سفر کر چکا تھا خوب صورت عورتوں کی تصویریں بنا کر شہزادہ کو دکھاتا ہے ان میں سے ایک دوشیزہ وہی تھی جسے شہزادے نے خواب میں دیکھا تھا۔ عطارد شہزادے کو بتلاتا ہے کہ دوشیزہ کا نام مشتری ہے اور وہ بنگلہ نگر کی شہزادی ہے۔ دوشیزہ کا پتہ معلوم ہونے کے بعد شہزادہ اپنے ماں باپ سے اجازت لے کر ایک لشکر کے ساتھ بنگلہ نگر کے سفر پر روانہ ہوتا ہے۔ عطارد اس کی رہنمائی کرتا ہے راستے میں ایک خوفناک اژدہے سے واسطہ پڑتا ہے۔

شہزادہ اس سے مقابلہ کرتا اور اپنی قوت اور قرآنی دعاؤں کی مدد سے اسے ہلاک کر دیتا ہے اس کے بعد ایک انتہائی طاقت ور اور خطرناک دیو اس کی راہ کی رکاوٹ بنتا ہے شہزادہ اسے بھی ہلاک کر دیتا ہے۔ دیو کے مسکن میں اس کی اسد خاں کے بیٹے مریخ خاں سے ملاقات ہوتی ہے۔ مریخ خاں مشتری کی بہن زہرا کی تلاش کے دوران میں دیو کا قیدی ہو گیا تھا۔ دیو کے ہلاک ہونے کے بعد قافلہ روانہ ہوا تو مہتاب پری کے باغ میں جا پہنچا۔ یہاں مہتاب پری شہزادے پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ عطارد شہزادے کو مہتاب پری کے پاس چھوڑ کر بنگلہ نگر روانہ ہوتا ہے اور وہاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہے اس کی شہرت سن کر مشتری کی دائی اسے مشتری کے پاس لے جاتی ہے۔ مشتری عطارد کو اپنے محل کی سجاوٹ کا کام سپرد کرتی ہے۔ عطارد محل کی دیواروں پر نقش و نگار بنانے کے بعد درمیان میں شہزادے محمد قلی قطب شاہ کی تصویر بھی بنا دیتا ہے۔

تصویر دیکھ کر مشتری شہزادے پر عاشق ہو جاتی ہے۔ عطارد شہزادے کی تعریف کرتا اور اسے بنگلہ نگر بلا لیتا ہے۔ یہاں شہزادہ مشتری سے اور مریخ خاں زہرا سے ملتے ہیں۔ مشتری اپنا راج پاٹ مریخ خاں اور زہرا کو سونپ کر شہزادہ کے ساتھ دکن کے لئے روانہ ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچنے پر ان کا استقبال ہوتا ہے شہزادے کے ماں باپ خوش ہو جاتے ہیں۔ شہزادے اور مشتری کی شادی ہو جاتی ہے دونوں ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ قطب مشتری کا قصہ وجہی کا طبع زاد ہے اس کی تعمیر و تشکیل میں وجہی نے لوک کہانیوں کے مختلف اجزا سے استفادہ کیا ہے۔ مثنوی کے پلاٹ کی ترتیب میں فن کاری کا فقدان ہے۔ واقعات سپاٹ ہیں ان میں اُلجھاؤ نہیں ہے۔ حیرت اور دل چسپی کی کمی ہے۔ کردار نگاری میں بھی وجہی نے مہارت نہیں دکھائی ہے۔ شہزادے اور مشتری کے کرداروں میں شہزادوں اور شہزادیوں کی سی شان نظر نہیں آتی۔ حرکت اور عمل میں بھی ان کے یہاں تیزی اور طرّاری نہیں ہے وہ صرف عشق کرتے ہیں اور اپنی کامیابی کے لئے دوسروں کے رہینِ منّت نظر آتے ہیں۔ قطب مشتری کا سب سے جان دار کردار عطارد ہے۔ جو اپنی فہم و فراست اور تدبر کا ثبوت دیتا ہے اور اپنی سمجھ بوجھ اور فن کاری سے شہزادہ کی محبت کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا سبب بنتا ہے۔

مثنوی قطب مشتری میں وجہی نے سراپا نگاری میں اپنی فن کاری دکھائی ہے اور دل کش تشبیہات اور استعارات کی مدد سے کرداروں کو موثر بنا دیا ہے۔ قطب مشتری میں جذبات نگاری کی عکاسی کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ جذبات کی پیش کش میں مثنوی نگار نے انسانی نفسیات اور حفظ مراتب کے ساتھ عورت مرد کے فرق کا لحاظ رکھا ہے۔ غم کے جذبات کے موثر بیانات کے علاوہ خوشی کے جذبات میں اور جنسی جذبات کے بیان میں وجہی نے شوخی سے کام لیا ہے۔ مثنوی میں اس دَور کی طرزِ زندگی، طرزِ معاشرت اور تہذیب و تمدّن کی تصویریں بھی ملتی ہیں اور عقائد و رسم و رواج کا پتہ بھی چلتا ہے۔ قطب مشتری میں وجہی نے شاعری اور اس کی خصوصیات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ان کے مطابق مثنوی میں بیان میں ربط و تسلسل اور سادگی و سلاست ملتی ہے۔ زبان قدیم اور نامانوس ہونے کے باوجود مشکل نہیں ہے۔ اس میں دل کشی اور روانی ملتی ہے۔ مثنوی قطب مشتری قطب شاہی دَور کی ابتدائی زمانہ کی تخلیق ہے اس کے باوجود ادبی اور فنی لحاظ سے اور شعری محاسن کے لحاظ سے دکنی مثنویات میں انفرادی حیثیت کی مالک ہے۔

ذیل میں اس اکائی کی خصوصیات پیش کی گئی ہیں:

﴿۱﴾ وجہی کا اصل نام اسد اللہ اور وجہی تخلص تھا۔ ﴿۲﴾ وجہی کی وفات ۱۰۶۶ھ اور ۱۰۸۱ھ کے درمیان میں ہوئی۔ ﴿۳﴾ قطب مشتری ۱۰۱۸ھ میں بارہ دنوں میں مکمل ہوئی تھی۔ ﴿۴﴾ قطب مشتری کی ابتدا حمد سے کی گئی ہے اس کے بعد مناجات ہے پھر نعت ہے پھر

معراج کا ذکر کیا گیا ہے پھر منقبت میں شعر کہے گیے ہیں۔﴿۵﴾ داستان کے آغاز میں شہنشاہ ابراہیم قطب شاہ کی مدح کی گئی ہے۔﴿۶﴾ قطب مشتری کا قصہ ایک عشقیہ قصہ ہے۔﴿۷﴾ شہزادہ محمد قلی قطب شاہ خواب میں ایک پیکر جمال حسینہ کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گیا۔ ﴿۸﴾ عطارد سے مشورہ کیا گیا تو اس نے اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ محمد قلی قطب شاہ نے خواب میں جس نازنین کو دیکھا ہے وہ بنگلہ نگر کی شہزادی مشتری ہے۔﴿۹﴾ مریخ خان حلب کے شاہ سرطان کے پردھان اسد خان کا اکلوتا بیٹا تھا وہ بنگالے کی شہزادی زہرا کے عشق میں گرفتار تھا۔﴿۱۰﴾ وجہی نے پلاٹ کی تعمیر وتشکیل میں بعض لوک کہانیوں کے اجزاء کو مربوط کر کے ان سے اپنے پلاٹ کا تانا بانا تیار کیا ہے۔ ﴿۱۱﴾ مثنوی کے پلاٹ میں خیر وشر کے معاملات پیش کرنے کی کوشش ضرور ہے لیکن ان کے درمیان تصادم میں زور واثر کا فقدان ہے۔

﴿۱۲﴾ قطب مشتری کے اہم کرداروں میں محمد قلی قطب شاہ مشتری عطارد، مہتاب پری، مریخ خاں، زہرا، ہیروئن کی دائی مہروان، مہتاب پری کی داسی سلکھن پری شامل ہیں۔﴿۱۳﴾ مثنوی میں مرکزی کردار ہیرو محمد قلی قطب شاہ کا ہے اس کے گرد ہی مثنوی کا پلاٹ بُنا گیا ہے اور اسے نہایت حسین وجمیل اور خاص صفات جیسے شجاعت ودلیری، ہمت وحوصلہ، عدل وسخاوت، قوت وطاقت اور علم وغیرہ میں یکتائے زمانہ بتایا گیا ہے۔﴿۱۴﴾ اس میں سب سے جان دار کردار عطارد کا ہے جو سب سے زیادہ باعمل، ہوشیار، دوراندیش، تجربہ کار، خوش طبع، حاضر دماغ اور معاملہ فہم انسان کی شکل میں سامنے آتا ہے۔﴿۱۵﴾ قطب مشتری میں وجہی نے شہزادے کے فراق میں مشتری کے جذبات کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ان کی جذبات نگاری کی خصوصیات کی مثال ہے۔﴿۱۶﴾ قطب مشتری میں ایسے اشعار کی تعداد خاصی ہے جن سے اس زمانے کی طرزِ زندگی، معاشرتی معاملات اور تہذیبی قدروں کا پتہ چلتا ہے۔﴿۱۷﴾ قطب مشتری کے ابتدائی حصے میں وجہی نے شعر وسخن کے بارے میں اپنے نظریات نظم کیے ہیں ان سے وجہی کے تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔﴿۱۸﴾ وجہی شعر کا اصل حسن اس کے اعلیٰ معنی کو قرار دیتا ہے اس کے خیال میں اس کی ظاہری ہیئت کو سنوار کر نورٌ علی نور بنایا جا سکتا ہے۔﴿۱۹﴾ وجہی نے اپنے ادبی تصورات میں لفظ ومعنی کے علاوہ صوری حسن میں اضافہ کے لئے صنائع بدائع کے استعمال پر بھی زور دیا ہے اس کا خیال ہے کہ اگر خوب صورت محبوب کو سنوارا جائے تو اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔﴿۲۰﴾ مثنوی قطب مشتری میں جا بجا محاورات اور ضرب الامثال اور تلمیحات کا بھی مناسب استعمال کیا گیا ہے۔

05.07 فرہنگ

آحال : مستی میں آکر

آراء : رائے

آرائش : سجاوٹ

آگاہ : باخبر، جاننے والا

آنا : دانا (کھانا)

آنب : آم

اپیں : آپ ہی

اتال : اب

سازندے : ساز، بجانے والے

سایہ فگن : سایہ ڈالنا

سیچڑی : سیج

سدبد : ہوش وحواس

سرو : ایک درخت جو بالکل سیدھا ہوتا ہے

سروداں : نغمہ، گانا، ایک قسم کا باجا

سنِ بلوغ : جوانی کی عمر

سنگات : ساتھ

اُچا : اُچا

اژدہا : اجگر، بڑا سانپ

ابردان : خیرات

اچھو : علاج

ادھار : سہارا

استحکام : مضبوطی

التزام : کسی بات کو لازم کرنا

ایک ٹھار : ایک مقام

باتاں : باتیں

باساں : خوشبو، مہک

باض : بغیر

بانی : بنیاد ڈالنے والا

بدائع : باریکیاں، شعر کی معنوی خوبی

بلیغ : کامل، فاضل

بندتے : بندھن

بوجھل : بھاری، لدھا ہوا

بودھن : عورت

بیا : مناسب

بے لاگ : صاف ستھرا

پاکدامنی : پارسائی، نیکی

پچھان : پہچان

پچھیں : بعدازاں

پست : نیچا

پیاک : درمیان

پیکر جمال : حسن کا نمونہ

پھانک : قتلہ، قاش

سوں : کی طرح

سیم : چاندی جیسی سفید جلد والا

شاطیر : شاطر

شہادت : راہِ خدا میں جان دینا

صرّیاں : صراحی

صنائع : کاری گری، ہنرمندی، شعر کی صوری خوبی

صوری حسن : ظاہری خوب صورتی

ضرب الامثال : کہاوت کی طرح مشہور بات

طبع زاد : ایجاد، اختراع، خود کی طبیعت سے پیدا

طراوات : ٹھنڈک

طرّاری : ہوشیاری، چالاکی

عجلت پسندی : جلد بازی

عسرت : غریبی

فراست : دانائی

فریفتہ : عاشق ہونا

فقدان : کمی، نہ ہونا

فہم : عقل، سمجھ

فہیم : ہوشیار

قدر و منزلت : رتبہ، عزت

قلابے : حلقہ، کنڈا

کاچ : کانچ

کاماں : کام

کچ : کچھ

کدھیں : کبھی

کلنک : داغ

کھیا : کہنا

پھلان : پھل
تحمل : برداشت
تخیلی : خیالی
تدبر : غور وفکر، دوراندیشی
تقلید : کسی کے قدم بہ قدم چلنا
تلمیحات : کلام میں کسی مشہور واقعہ کی طرف اشارہ کرنا
تلنگ : چالیں
تمدنی : سماجی، معاشرتی
تنقیدی شعور : کسی چیز کی جانچ پرکھ کی صلاحیت
توازن : ہم وزن ہونا
تیرپیچ : تین گنا
ٹیٹنے : چبھنے لگے
ٹھار : مقام، جگہ
جانشینی : جگہ پر بیٹھنا
جدت : نیاپن، تازگی
جگنے : جگنو
جلال : عظمت، شان وشوکت
جواز : اجازت، جائز
جودوسکا : کرم اور فیّاضی
جہان گرد : دنیا گھومنے والا
جیوں : جیسا
چُکہ : ذرا
چھند : فریب
حرمت : عزت وآبرو
حفظِ مراتب : مرتبہ کا لحاظ، پاسِ ادب
خامی : خامی، کچاپن، نقص

گام زَن : چلنا
گریز : پرہیز، علاحدگی
گفتار : بات چیت
گمتا : گزارنا
گنواں : کھونا
لک : تک، تلک
متے : مست
مجاز : حقیقت کے برعکس
محاسن : خوبیاں، اچھائیاں
محاکمہ : حکم یا فیصلہ کرنے والا
محرک : حرکت دینے والا
مرصع : سجی ہوئی
مرغاں : پرندے
مرقعوں : تصویروں
مست : مدہوش
مستند : سند یافتہ
مظاہرے : باہم ظاہر ہونا
معائب : عیب، برائیاں
مفاد : فائدہ
منجے : مجھے
منے : میں، درمیان
موقع شناسی : موقع پہچاننا
مہارت : عشق، استادی
نازنین : دل فریب، نازک دوشیزہ
نازونعم : لاڈ پیار
ناصحانہ : نصیحت

خوباں	: محبوب	نالے	: چھچھے
دادعیش	: عیش کرنا	ندرت	: انوکھا پن
درپردہ	: پیچھے	نظام	: بنیاد، ترتیب
درہم برہم	: اُلٹ پلٹ	نظریات	: وہ مسئلہ جس میں نظر وفکر سے کام لیا جائے
دست بردار	: چھوڑنا	نقالی	: نقل کرنا
دسیا	: دکھائی دینا	نقّاد	: تنقید کرنے والا
دیس	: دن	نکو	: نہیں
دھات	: قسم	نگہداشت	: نگرانی کرنا
دھروں	: رکھوں	نوا	: نیا
راجادھراج	: بادشاہ کا لقب	نورعلیٰ نور	: نور پر نور ایک سے بڑھ کر ایک
رعایت لفظی	: ایک لفظ کی رعایت سے دوسرا لفظ لانا	ہست	: ہاتھی
رمال	: ہندسوں کے ذریعے چھپی ہوئی باتیں بتانے والا	ہنروند	: صاحب ہنر
رہنہار	: رہنے والا	یتا	: اتنا
رہین منت	: محتاج	یکتائے زمانہ	: زمانے میں ایک
زیاست	: زیادہ	یک ڈک	: یک دم
ساج	: سجنا	یکس تے	: ایک سے

05.08 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ قطب مشتری کی کردار نگاری کا جائزہ لیجیے

سوال نمبر۲ قطب مشتری کی جذبات نگاری پر اظہار خیال کیجیے

سوال نمبر۳ مثنوی قطب مشتری کا قصہ اپنے الفاظ میں تحریر کیجیے

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ قطب مشتری کی منظر نگاری کا جائزہ لیجیے

سوال نمبر۲ قطب مشتری میں استعمال کی گئی تلمیحات تحریر کیجیے

سوال نمبر۳ قطب مشتری کے کرداروں کا مختصر تعارف کرائیے

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : وجہی کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) انعام اللہ (ب) عبداللہ (ج) نصر اللہ (د) اسد اللہ

سوال نمبر۲ : ''قطب مشتری'' کب تصنیف ہوئی؟

(الف) ۹۱۸ھ (ب) ۱۰۱۵ھ (ج) ۱۰۲۵ھ (د) ۱۰۱۸ھ

سوال نمبر۳ : درجِ ذیل میں سے کس صنف میں پیغمبر کی تعریف کی جاتی ہے؟

(الف) حمد میں (ب) مناجات میں (ج) نعت میں (د) منقبت میں

سوال نمبر۴ : ''قطب مشتری'' کے ہیرو کا نام کیا ہے؟

(الف) عبداللہ قطب شاہ (ب) محمد قطب شاہ (ج) محمد قلی قطب شاہ (د) ابراہیم قطب شاہ

سوال نمبر۵ : ''مشتری'' کی بہن کا نام کیا تھا؟

(الف) مہتاب (ب) زہرا (ج) مہروان (د) حمیرا

سوال نمبر۶ : ''عقائد'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) عقیدت (ب) عقدہ (ج) عقیدہ (د) عقد

سوال نمبر۷ : ''سب رَس'' کس شاعر کی کتاب ہے؟

(الف) ملا وجہی (ب) غواصی (ج) نصرتی (د) ہاشمی

سوال نمبر۸ : ''عطارُد'' کیا تھا؟

(الف) بادشاہ (ب) وزیر (ج) غلام (د) مصوّر

سوال نمبر۹ : قطب مشتری کی ''ہیروئن'' کا نام کیا ہے؟

(الف) مہتاب (ب) سلکھن (ج) مشتری (د) زَہرا

سوال نمبر۱۰ : ''مفاد'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) نقصان (ب) فائدہ (ج) گھاٹا (د) خسارہ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (د) اسد اللہ

جواب نمبر۲ : (د) ۱۰۱۸ھ

جواب نمبر۳ : (ج) نعت میں

جواب نمبر۴ : (ج) محمد قلی قطب شاہ

جواب نمبر۵ : (ب) زہرا

جواب نمبر۶ : (ج) عقیدہ

جواب نمبر۷ : (الف) ملا وجہی

جواب نمبر۸ : (د) مصور

جواب نمبر۹ : (ج) مشتری

جواب نمبر۱۰ : (ب) فائدہ

05.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ تاریخ ادب اردو جلد سوم و چہارم از پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین

۲۔ قطب مشتری۔اسداللہ وجہی از ڈاکٹر حمیرہ جلیلی

۳۔ قصۂ حسن و دل (مقدمہ صفحہ ۳۸) از جاوید وششٹ

۴۔ سب رس کی تنقید تدوین (مقدمہ صفحہ ۱۶) از ڈاکٹر حمیرہ جلیلی

۵۔ رسالہ ''سب رس'' حیدرآباد، جنوری-فروری ۱۹۶۶ء

اکائی 06 میر حسن: مثنوی سحر البیان

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد

06.02 : تمہید

06.03 : میر حسن کے حالاتِ زندگی

06.04 : میر حسن کی ادبی خدمات

06.05 : مثنوی ''سحر البیان'' کی خصوصیات

06.06 : مثنوی ''سحر البیان'' کی دیگر خصوصیات

06.07 : مثنوی ''سحر البیان'' انتخاب (آغاز داستان) متن

06.08 : مثنوی ''سحر البیان'' انتخاب (آغاز داستان) تشریح

06.09 : خلاصہ

06.10 : فرہنگ

06.11 : سوالات

06.12 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

پچھلی اکائیوں میں آپ نے مثنوی کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی۔ ساتھ ہی کچھ اہم مثنوی نگاروں میں کے بارے میں جانا۔ اس اکائی میں آپ اردو کے مشہور مثنوی نگار میر حسن اور ان کی مثنوی ''سحر البیان'' سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔ اس اکائی میں میر حسن کی حیات، ان کی ادبی خدمات، مثنوی سحر البیان کی خصوصیات اور مثنوی کا کچھ انتخاب (کچھ حصہ) پیش کیا جائے گا۔ ساتھ ہی منتخب اشعار کی تشریح بھی کی جائے گی۔ امتحانات میں پوچھے جانے والے سوالات کا نمونہ امتحانی سوالات کے تحت دیا جائے گا۔ اس اکائی کا مقصد ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں کہ میر حسن کی حیات وادبی خدمات اور سحر البیان کے متعلق گفتگو کر سکیں۔

06.02 تمہید

مثنوی اردو کی ایک اہم صنف ہے۔ ہمارے قدیمی اردو سرمائے میں مثنویاں ملتی رہی ہیں۔ دکن اور شمالی ہند دونوں دبستانوں کے شعرا نے بے شمار مثنویاں لکھیں۔ شمالی ہند میں لکھی جانے والی مثنویوں میں دو مثنویاں سب سے زیادہ مشہور ہوئیں۔

ایک میر حسن کی ''سحر البیان''اور دوسری دیا شنکر نسیم کی ''گلزارِ نسیم''۔سحر البیان دہلوی تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے تو گلزارِ نسیم لکھنوی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔سحر البیان جزئیات نگاری،منظر نگاری،جذبات نگاری اور زبان و بیان غرض کہ ہر اعتبار سے لاجواب مثنوی ہے۔یہ مثنوی ۲۱۷۹ اشعار پر مشتمل ہے۔اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک بہترین مثنوی کے لئے لازمی قرار دی جاتی ہیں۔ذیل میں ہم اس مثنوی کے تخلیق کار میر حسن کا بھی مطالعہ کریں گے اور ساتھ ہی ان کی اس لافانی مثنوی کی اہم خوبیوں سے بھی فائدہ حاصل کریں گے۔

06.03 میر حسن کے حالاتِ زندگی

میر غلام حسن نام اور حسنؔ تخلص تھا۔آپ ۱۷۳۷ء میں محلّہ سید واڑہ دہلی میں پیدا ہوئے۔والد کا نام میر غلام حسین ضاحکؔ تھا۔جو ایک اچھے شاعر،زندہ دل،ظریف الطبع اور صوفی منش انسان تھے۔میر حسن کے آباؤ اجداد شہر ہرات کے رہنے والے تھے جو دہلی آئے اور پھر دہلی کی تباہی کے بعد فیض آباد اور لکھنؤ میں رہائش پذیر ہوئے۔آپ کا خاندان اہل سادات سے تھا۔میر حسن کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ان کے والد نے انہیں درسی کتابیں پڑھائیں۔عربی،فارسی اور اردو پر کچھ عبور حاصل کر لیا مگر باضابطہ اور اعلیٰ تعلیم سے وابستہ نہ ہو سکے۔والد ہی کی سرپرستی اور صحبت سے فیض اُٹھایا۔انہیں کے فیض سے شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ابتدائی زمانے میں میر حسن نے اردو کے مشہور صوفی شاعر خواجہ میر دردؔ سے فیض حاصل کیا۔دردؔ کی صحبت کا ان پر بڑا اثر ہوا۔اس کے علاوہ میر حسن نے مشہور قصیدہ نگار مرزا محمد رفیع سوداؔ سے بھی شرفِ تلمذ حاصل کیا۔حالاں کہ بعض مورخین نے سوداؔ کی شاگردی سے انکار کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۷۷۱ء میں جب نواب احمد یار خاں کا انتقال ہو گیا تو سوداؔ فیض آباد چلے آئے جب کہ سلطنت کا مرکز لکھنؤ بنا تو سوداؔ بھی لکھنؤ آ گئے۔یہاں میر حسن نے اپنا کچھ کلام اصلاح کی غرض سے سودا کو دکھایا۔اس کا ذکر سحر البیان کے دیباچہ میں ملتا ہے جس کو میر شیر علی افسوسؔ نے رقم کیا ہے۔میر ضیاء الدین ضیاؔء سے بھی میر حسن نے اپنی غزلوں کی اصلاح لی۔میر حسن نے شعر گوئی کے طرز کو درد،میر اور سودا کے رنگ میں اختیار کیا جس کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے:

''اصلاحِ سخن از میر ضیاء سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز اوشاں از من کماحقہ سرانجام نیافت برقدم دیگر
بزرگاں مثل خواجہ میر درد،مرزا رفیع السودا اور میر تقی میر پیروی نمودم۔''

(تذکرہ میر حسن ص..۸۵)

میر حسنؔ کے عہد میں دہلی انتشار سے دوچار تھی۔بیرونی حملہ آوروں اور اندرونی سازشوں نے دہلی کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ایسے میں میر ضاحکؔ نے دوسرے دہلوی شعرا کی طرح دہلی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔میر حسنؔ عین جوانی میں اپنے والد کے ہم راہ دلی سے نکل کر ڈیگ اور مکن پور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔اس سفر کا حال میر حسن میں اپنی مثنوی گلزارِ ارم میں لکھا ہے۔کچھ وقت لکھنؤ رہ کر فیض آباد چلے آئے۔نواب سالار جنگ کی خدمت میں ایک قصیدہ پیش کیا جس کی بنا پر ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔نواب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے نواب میر نوازش علی کی صحبت میں دس گیارہ سال گزارے۔

جب میر حسن فیض آباد میں تھے تو وہاں انہیں کسی خاتون سے عشق ہو گیا۔یہ ان کا دوسرا معاشقہ تھا۔پہلا وہ دہلی میں کر چکے تھے۔نواب آصف الدولہ کے زمانے میں میر حسن پھر لکھنؤ آ گئے۔ابھی ان کو آئے دو برس ہی گزرے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور انہیں پھر واپس فیض آباد آنا پڑا۔دورانِ قیامِ فیض آباد انہوں نے نواب آصف الدولہ کی شان میں قصیدہ بھیجا مگر آصف الدولہ ان سے کچھ بدظن ہو گئے تھے لہٰذا اب ان کا دربار تک رسائی ہونا ناممکن ہو گیا۔دربار سے ملنے والا وظیفہ بھی بند ہو گیا۔

آخری دَور میں میر حسن پھر لکھنؤ آ گئے اور یہیں انہوں نے ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۸ء میں انتقال کیا اور مرزا قاسم علی خاں کے باغیچہ کے عقبی حصہ میں دفن کیے گئے۔ مصحفی نے درجِ ذیل تاریخِ وفات کہی۔

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں رد . ازیں گلزار رنگ و بو بتافت

بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی شاعر شیریں بیاں ، تاریخ یافت

میر حسن شکل وصورت میں میانہ قد تھے، خوش اندام اور رنگ گورا تھا، اچھا لباس زیب تن کرتے، بانکی ٹوپی پہنتے۔ زیب کا کرتا ہوتا، آستین پھنسی ہوئی ہوتیں اور کمر سے پٹکا باندھتے تھے۔ علی ابراہیم خاں نے گلزارِ ابراہیم میں اخلاق وعادات کے متعلق لکھا ہے کہ بہت سنجیدہ اور خوش خلق آدمی تھے۔ انہوں نے کبھی معیوب کلام نہیں کہا۔ میر حسن کے چار بیٹے میر احسن خلیق، میر مستحسن خلیق، میر محسن اور محسن تھے۔ جن میں تین شاعر ہوئے اور ان میں سے دو صاحبِ دیوان شاعر۔ میر خلیق کے بیٹے میر انیس تھے جو مرثیہ نگاری میں آفتاب بن کر چمکے۔ میر حسن نے مثنوی اور قصیدہ کے علاوہ غزلیں اور رباعیات بھی کہی ہیں۔

06.04 میر حسن کی ادبی خدمات

میر حسن نے کئی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔ ان کے دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ''تذکرۂ شعرائے اردو'' کے نام سے ایک تذکرہ بھی مرتب کیا۔ مثنوی نگاری میں میر حسن نے ۱۲ر مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان کی پہلی مثنوی کا نام ''مثنوی شادی آصف الدولہ'' ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی رموز العارفین ۱۷۷۵ء، مثنوی گلزارِ ارم ۱۷۷۹ء، مثنوی در وصف قصر جواہر ۱۷۸۵ء، تہنیتِ عید ۱۱۹۹ھ اہم مثنویاں ہیں۔ ''سحر البیان'' میر حسن کی آخری عمر کی تصنیف ہے جو کہ ۱۷۸۴ء میں لکھی گئی۔ مثنوی ''رموز العارفین'' کا موضوع اخلاق وتصوّف ہے۔ اس میں میر حسن نے شاہِ بلخ حضرت ابراہیم اَدہم رضی اللہ عنہ کا سلطنت سے کنارہ کش ہو کر فقیر ہونے کا حال پر اثر انداز میں تحریر کیا ہے اور اس کے ساتھ بزرگوں کے اقوال اور تمثیلیں بھی پیش کی ہیں۔

''گلزارِ ارم'' میں دہلی سے لکھنؤ اور فیض آباد کے سفر کا بیان ہے۔ گلزارِ ارم اس کا تاریخی نام ہے۔ اس سے نہ صرف میر حسن کے سفر کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس سفر کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس مثنوی کے مطابق پہلے چند مہینے دیگ میں رہے پھر مکن پور گئے۔ مکن پور میلہ کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ مثنوی کے آخر میں لکھنؤ کی مذمت اور فیض آباد کی تعریف کرتے ہوئے اسے باغِ فردوس سے تعبیر کیا ہے۔ سحر البیان کے بارے میں میر حسن کے فنی کمالات کا مطالعہ آپ اس اکائی میں آگے کریں گے۔

میر حسن نے لگ بھگ ۵۰۰ر کے قریب غزلیں کہی ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہی کیا۔ بعض ناقدین نے انہیں میر سوز اور میر تقی میر کے دوش بدوش غزل گو کہا ہے۔ میر حسن کی غزل گوئی کے متعلق مظفر حنفی کا کہنا ہے کہ:

> ''تغزل کا وہ رنگ جس کے لئے آگے چل کر مومن مشہور ہوئے یعنی غزل میں مضامین حسن وعشق تک ہی محدود کر لینا اور اسی محدود دائرے میں گلکاری کرنا پہلے پہل میر حسن نے اختیار کیا۔ رعایتِ لفظی کا حسن، تشبیہ واستعارے کا خوب صورت استعمال، ترکیب سازی کا ہنر، صنعت کاری، چستیِ بندش، بیان کی برجستگی

اور بے ساختگی اور پیکر تراشی کی حسین مثالیں کلامِ میر حسن میں جگہ جگہ دامن کو کھینچتی ہیں اور زبان و بیان کی طرفہ کاری، تخیل کی ندرت اور طرزِ ادا کی دل کشی قدم قدم پر خراجِ تحسین طلب کرتی ہے۔''

(انتخاب کلامِ میر حسن، مرتبہ پروفیسر مظفر حنفی..ص ۳۶)

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ میر حسن کی غزلیں سادگی، دل فریبی اور عاشقانہ رنگ میں وہی لطف دکھاتی ہیں جو اردو کے نام وَر غزل گو شعرا کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ میر حسن کو قصیدہ گوئی میں عبور نہ تھا اگر چہ انہوں نے چند قصائد لکھے ہیں۔ یہ قصائد سالارِ جنگ آصف الدولہ، آفریں علی خاں، جواہر خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں۔ یہ معمولی درجہ کے غیر اہم قصائد ہیں۔ خاندانی روایت کے مطابق میر حسن نے مرثیہ اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کی رباعیاں کافی تعداد میں ملتی ہیں۔

میر حسن جب فیض آباد میں تھے تو انہوں نے ''تذکرۂ شعرائے اردو'' قلم بند کیا۔ میر کے ''نکات الشعرا'' کے تقریباً ۲۷ر سال بعد میر حسن نے اپنا تذکرہ تحریر کیا۔ اس تذکرہ میں سو شعرا کا حال درج ہے۔ اس کا بڑا حصہ مصنف کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ بذاتِ خود بہت سے شعرا کے بارے میں واقفیت رکھتے تھے۔ چنانچہ میر، سودا، درد، اثر اور مظہر وغیرہ کو انہوں نے دیکھا تھا۔ اس لئے اس تذکرہ میں درج شعرا کے حالات ان کی آنکھوں دیکھے ہیں۔ اس تذکرہ کی تقسیم و ترتیب تین ادوار پر مبنی ہے۔ یعنی دورِ متقدمین، متوسطین اور متاخرین کے شعرا کو ردیف وار حروف تہجی کے حساب سے درج کیا گیا ہے اس تذکرہ کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ اس کے ذریعے اردو کی ارتقائی تاریخ کے مطالعے میں مدد ملتی ہے۔

06.05 مثنوی ''سحر البیان'' کی خصوصیات

اُردو مثنویوں میں سحر البیان ایک شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اردو ادب کی ایک زندہ اور جاوید تخلیق شمار کی جاتی ہے۔ میر حسن نے یہ مثنوی بڑی محنت اور جاں فشانی سے لکھی اور اس میں تمام فنی نزاکتوں کو ملحوظ رکھا۔ اس میں جو دل کشی اور ساحری پائی جاتی ہے اس سے دوسری مثنویاں محروم ہیں۔ یہ مثنوی ہر زمانے میں خواص و عوام دونوں میں مقبول رہی ہے۔ سحر البیان کے تنقیدی جائزے میں جب ہم اس فنی اور ادبی محاسن دیکھتے ہیں تو اس کی کردار نگاری، پلاٹ، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، مرقع نگاری، منظر نگاری، سراپا نگاری کے علاوہ زبان و بیان کی بے شمار خوبیاں نظر آتی ہیں۔ یہ مثنوی اپنے عہد کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ یہ اپنے دور کی زبان کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔ دبستانِ دہلی کی خصوصیات اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس لئے اس میں دہلوی زبان کی سادگی، صفائی، سلاست اور روانی کی بہترین جلوہ گری پائی جاتی ہے۔ اس کی جملہ خصوصیات کا خود میر حسن کو بھی احساس تھا چنانچہ اس مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

ذرا منصفو ! داد کی ہے یہ جا — کہ دریا سخن کا دِیا ہے بہا
زِبس عمر کی اِس کہانی میں صَرف — تب اَیسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہوگیا ہوں مَیں پِیر — تب اَیسے ہوئے ہیں سخن بے نظیر
نہیں مثنوی، ہے یہ اک پھُل جھڑی — مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں — نہیں مثنوی، ہے یہ سحر البیاں

﴿پلاٹ﴾:۔سحرالبیان اپنے قصوں کے لحاظ سے کوئی نئی چیز نہیں بلکہ وہی عام باتیں جو اس دور کی داستانوں میں بکثرت ملتی ہیں۔ سحرالبیان میں ایک بادشاہ کا لاولد ہونا، نجومیوں کی پیشین گوئی، پری کا عاشق ہونا، شہزادے کا ایک دوسری شہزادی پر فدا ہونا، وزیرزادی کی مدد سے دونوں کا ملنا وغیرہ اس کے جزو ہیں۔ یہ مثنوی شہزادہ بےنظیر اور شہزادی بدرمنیر کے عشق کی داستان ہے۔ حالاں کہ میرحسن نے قصہ کے سلسلے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہ ایک نیا قصہ ہے مگر مثنوی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ قصہ کے مختلف اجزاء دراصل مختلف قصوں سے لیے گئے ہیں۔ میرحسن نے تمام اجزاء کو نہایت فن کارانہ چابک دستی کے ساتھ ایک دوسرے سے جوڑ کر اس کا کامیاب پلاٹ تیار کیا ہے۔ قصہ میں کہیں جھول نہیں آنے دیا۔ شروع سے آخر تک کہانی قاری کو جوڑے رکھتی ہے۔ میرحسن کو پڑھتے ہوئے قاری اتنا گم ہو جاتا ہے کہ ہر واقعہ بالکل نیا معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح میرحسن نے داستان کے پلاٹ کی تعمیر میں تمام ضروری باتوں کا احترام کیا ہے۔

اس کے پلاٹ کے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی کا خیال ہے کہ:

''فنی لحاظ سے سحرالبیان کا جائزہ لیا جائے تو اس ضمن میں میرحسن کی ذہانت پلاٹ کی تشکیل کے لئے بروئے کار نظر آتی ہے۔''

﴿کردارنگاری﴾:۔سحرالبیان میں کردار نگاری کی تعداد زیادہ نہیں ہے، بادشاہ، بےنظیر، ماہ رخ، بدرمنیر، نجم النساء، مسعود شاہ اور فیروز شاہ۔ ان میں چار اہم کردار شہزادہ بےنظیر، شہزادی بدرمنیر، وزیرزادی نجم النساء اور پری ماہ رخ کے ہیں۔ شہزادہ بےنظیر مثنوی کا مرکزی کردار ہے۔ اس کا کردار روایتی شہزادوں جیسا ہی ہے۔ ایک مثالی ہیرو کی صفات اس کے اندر موجود ہیں یہ ایک کمزور کردار ہے جو اپنے آپ کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دتا ہے۔ حالات کو بدلنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کی صفات میں تمام خوبیاں ہی خوبیاں موجود ہیں۔ انسانی فطرت کے عیوب اس میں نام کو نہیں۔ خوب صورتی اور حسن وجمال میں وہ بےمثال ہے۔ اس کے حسن کی تعریف کچھ اس طرح کی گئی ہے:

عجب صاحبِ حُسن پیدا ہوا جسے مہر و مَہ دیکھ شیدا ہوا
نظر کو نہ ہو حُسن پر اُس کے تاب اُسے دیکھ، بے تاب ہو آفتاب

مختلف ہنر سے آراستہ ہونے کے باوجود پری کی قید میں بےبس رہتا ہے۔ محبوبہ کی جدائی میں آنکھیں بھرتا ہے۔ والدین کی اجازت لیے بغیر شہزادی بدرمنیر سے شادی کر لیتا ہے، بہرحال اس کردار میں خوبیاں کم اور خامیاں زیادہ نظر آتی ہیں۔

شہزادی بدرمنیر اس مثنوی کا دوسرا اہم کردار ہے۔ میرحسن نے اس کردار کو نہایت خوب صورتی سے تراشا ہے۔ بدرمنیر جذباتِ عشق میں مکمل عورت نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ عورت کی دیگر فطری خصوصیات بھی اس میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی نشست و برخاست، گفتگو، طور و اطوار، چال ڈھال اور حسنِ ذوق سے اس کا شہزادی ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حسن خوبی، ناز وادا، متانت، وقار اور شان وشوکت اور عیش ومحبت اس کے کردار کی دیگر خوبیاں ہیں۔ عشق میں شدتِ جذبات، جدائی کے غم، سب چیزوں سے کنارہ کشی، بےقراری کا عالم اور محبوب کے ہجر میں آنسو بہانا اس کردار کی خصوصیات ہیں۔ بدرمنیر میں پائی جانے والی ایک عام عورت کو میرحسن اس طرح بیان کرتے ہیں:

مَرو تم پری پر، وہ تم پر مَرے بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پَرے
میں اِس طرح کا دل لگاتی نہیں یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں

تیسرا اہم کردار وزیرزادی نجم النساء کا ہے۔ یہ اس مثنوی کا سب سے زیادہ متحرک وفعال کردار ہے۔ یہ کردار اتنا جان دار ہے کہ مثنوی کے دونوں مرکزی کرداروں پر سبقت لے جاتا ہے۔ نجم النساء کے کردار میں رنگینی، شوخی، بے نفسی، ایثار وقربانی کا جذبہ اور فرض شناسی کے اوصاف پائے جاتے ہیں وہ ذہین، سوجھ بوجھ اور درد بھرا دل رکھنے والا کردار ہے۔ نجم النساء کے کردار میں انسانی ہم دردی کی گہری چھاپ ملتی ہے۔ میر حسن نے کئی مقامات پر قصہ کو اسی کردار کے سہارے آگے بڑھایا ہے۔ پروفیسر احتشام کی رائے میں سحر البیان میں سب سے اہم کردار نجم النساء کا ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ سحر البیان ہی میں نہیں تمام مثنویوں میں اپنی مثال آپ ہے۔

بقول عابد علی عابد:

''نجم النساء کی تخلیق میں میر حسن نے اپنی ساری صنعت گری صرف کر دی ہے۔''

نجم النساء کی دوشیزگی کا بیان میر حسن نے یوں کیا ہے:

نہا دھو کے نکلی عجب آن سے کہ الماس نکلے ہے جوں کان سے

ماہ رخ پری چوتھا اہم کردار ہے۔ ماہ رخ کے کردار میں ایک عورت کی رقابت، حسد اور جلن دکھائی دیتا ہے۔ وہ شہزادے پر عاشق ہو کر اس کو پرستان لے جاتی ہے اور اس کو ہر طرح سے اپنا بنانے کا جتن کرتی ہے مگر ناکام رہتی ہے۔ اس طرح اس کردار میں خوب صورتی، حیا داری، عشق پسندی کے ساتھ ساتھ رقابت اور انتقام کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ محبت میں ناکام ایک عورت کا فطری کردار اس میں موجود ہے۔

﴿منظر نگاری﴾:۔ منظر نگاری کے بہترین نمونے اس مثنوی میں پائے جاتے ہیں۔ مثنوی کے اس وصف میں میر حسن نے جس دقت نظر کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی فن کاری کی دلیل ہے۔ انہوں نے جس منظر کو پیش کیا وہ متحرک ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ فطرت کی عکاسی ان کے یہاں زیادہ نکھری ہوئی ہے۔ باغ کا بیان ہو یا نہر کے کنارے پھولوں کا جھومنا، سرو کے درختوں پر قمریوں کا چہچہانا یا پھر چاندنی رات کا عالم، سبزے کی لہک یا گلوں کی مہک یا پھر غنچوں کی چٹک، ہر جگہ میر حسن نے اپنے شاعرانہ کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔

میر حسن کی مناظر فطرت کی پیش کش کے بارے میں عابد لکھتے ہیں:

''میر حسن اس معاملے میں یکتا ہیں کہ انہوں نے فطری مناظر کی دل کشی اور رعنائی کو اپنی روح میں جذب کیا اور پھر اس رعنائی کو پڑھنے والوں تک اس طرح منتقل کیا کہ اس کی صنعت گری کا عالم دیکھ کر بڑے سے بڑا نقاد انگشت بدنداں ہے۔''

مثال کے طور پر چاندنی رات کا یہ منظر ملاحظہ کیجیے:

وہ سنسان جنگل، وہ نورِ قمر وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اُجلا سا میداں، چمکتی سی ریت لگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

﴿جذبات نگاری﴾:۔ جذبات نگاری کے بہترین مرقع اس مثنوی میں ملتے ہیں کوئی بھی موقع ہو اور کوئی بھی کردار حسب حال اس کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ خوشی کے عالم میں خوشی اور رنج و دکھ و اَلم کے موقع پر رقت آمیز منظر کشی کی گئی ہے۔ جب نظیر چھت سے غائب ہو جاتا ہے اور ایک کہرام برپا ہوتا ہے۔ اس وقت کے جذبات کو اس طرح پیش کیا ہے:

کوئی دیکھ یہ حال رونے لگی — کوئی غم سے جی اپنا کھونے لگی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب — کسی نے کہا: گھر ہوا یہ خراب
سنی شہ نے القصہ جب یہ خبر — گرا خاک پر کہہ کے: ہائے پسر

﴿جزئیات نگاری﴾:۔ جزئیات نگاری میں میر حسن کو بڑا کمال حاصل ہے۔ انہوں نے جس واقعہ کا ذکر کیا اس کے ہر ایک جز کو مکمل بیان کر دیا۔ اس مثنوی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ جو بات جس موقع پر سب سے زیادہ موزوں اور سب سے زیادہ مناسب ہو ناممکن ہو، وہ اسی طرح بیان کی گئی ہے۔

ہنسا کھل کھلا وہ گلِ نو بہار — لیا کھینچ پاؤں کو بے اختیار
عجب عالَم اُس نازنیں پر ہوا — اثر گدگدی کا جبیں پر ہوا

سحر البیان ایک بڑا کمال اس کی تصویر کشی بھی ہے۔ میر حسن نے جس منظر اور جس حالات کا جہاں بھی نقشہ کھینچا تصویر کشی کا حق ادا کر دیا۔ اس میں ایسی محاکات کا ثبوت دیا کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

سحر البیان کی اس خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

غرض کہ جو کچھ بھی اس مثنوی میں بیان کیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھینچ دی ہے۔''

﴿مکالمہ نگاری﴾:۔ میر حسن نے دہلی و لکھنؤ دونوں کی تہذیب و تمدن اور عوام کی بول چال کو دیکھا اور سمجھا تھا۔ لہٰذا یہ تمام چیزیں مکالمہ نگاری کے وقت کام آئیں اور اس طرح سحر البیان کی مکالمہ نگاری نہایت فطری انداز اختیار کر گئی۔ میر حسن کے تجربات و مشاہدات نہایت وسیع تھے۔ انہیں مختلف لوگوں اور تہذیب و ثقافت کی زبان کو سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ان کا ہر کردار اپنی گفتگو میں وہی الفاظ اور انداز اختیار کرتا ہے جو عین اس کی فطرت کے مطابق ہوتی ہے۔ بے نظیر جب ماہ رخ پری سے ملنے کے واسطے بدر منیر سے رخصت چاہتا ہے۔ تب مکالمہ نگاری کا انداز دیکھیے:

کہا: اک پہر کی ہے رخصت مجھے — زیادہ نہیں اِس سے فرصت مجھے

تب بدر منیر جواب میں کہتی ہے:

مرو تم پری پر، وہ تم پر مرے — بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے

06.06 مثنوی ''سحر البیان'' کی دیگر خصوصیات

﴿تہذیب و ثقافت کی عکاسی﴾:۔ سحر البیان اپنے عہد کی سماجی، معاشرت اور تہذیبی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ اَودھ کے درباروں سے لے کر کوچہ و بازار تک میر حسن گہرے طور پر واقف تھے۔ ساتھ ہی اس وقت کے تمام رسوم و رواج اور اعتقادات پر بھی گہری

نگاہ تھی۔اس لئے اس مثنوی میں اس دور کے ماحول کا بھرپور نقشہ پایا جاتا ہے۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس مثنوی کو تہذیبی دستاویز کہا ہے۔

سید عابد حسین اس مثنوی کی خوبیوں میں شامل تہذیب وثقافت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میر حسن نے جس معاشرت کی تصویر کھینچی ہے وہ نوابّان اَودھ اور لکھنؤ سے متعلق ہے۔رعایا خوش حال، پرجا فارغ البال، ہر ہفتے کوئی نہ کوئی تقریب، میلے ٹھیلے، ڈیرے دار طوائفیں، شوخ وشنگ اور چست چالاک ناچنے والیاں، لوگ موسیقی کے رسیا، ٹھمریوں کے پھولوں کے شیدائی، فرماں روا، داستان گوئی اور داستان طرازی کی طرف مائل، خوب صورت باغ لگوانے کے مشتاق، شہزادیاں اور ناز ونعمت میں پلی ہوئی، سات محل کی خواصیں کہ جن کا نام سن کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور آجائے۔''

اس دَور کے رقص کی ایک محفل کا نظارہ دیکھیے:۔

انگھوٹھے کی لے سامنے آرسی وہ صورت کو دیکھ اپنی گلزار سی
اُلٹ آستیں اور مہری کے چاک نئے سر سے انگیا کو کر ٹھیک ٹھاک
دوپٹے کو سر پر اُلٹ اور سنبھل یکا یک وہ صف چیر آنا نکل

﴿اُسلوب﴾:۔سحرالبیان میں اسلوب کی مختلف خصوصیات پائی جاتی ہیں۔زبان وبیان سے لے کر تسلسل وترتیب تک کی تمام خوبیاں اس میں موجود ہیں۔انداز بیان کی خوبی اور اسٹائل اور زبان کی لطافت نے مثنوی کو بے حد دل چسپ بنا دیا ہے۔مثنوی کے لئے زبان کا صاف ستھرا، برجستہ، شگفتہ اور فصیح وبلیغ ہونا ضروری ہے۔اس مثنوی میں زبان وبیان سے متعلق اس طرح کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔یہ اپنے دَور کے زبان کی نمائندگی کرتی ہے۔دبستان دہلی کی زبان کی خوبیاں: سادگی، سلاست، صفائی اور روانی وغیرہ اس میں بدرجۂ اَتم موجود ہیں۔

اس کی زبان کے متعلق محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں لکھتے ہیں:

''کیا اُسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ کہا صاف کہا وہی محاورہ اور وہی گفتگو جو اب ہم تم بول رہے ہیں۔''

تکلف وتصنع سے دور اور بہترین تشبیہات واستعارات سے بھرپور اس مثنوی میں محاوروں اور روزمرّہ کا استعمال بھی نہایت فن کارانہ انداز میں کیا گیا ہے۔محاکات کی بہترین مثالیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں۔میر حسن کا عہد ان پر اپنے جمالیاتی تصورات کی شعائیں ڈال رہا تھا۔ان کے یہاں صنعتوں کا استعمال بھی ایک خاص انداز میں ہوا ہے۔خاص طور پر صنعتِ ایہام جس کے لئے میر حسن نے ''مگر بسیار بستگی بستہ شود'' کی قید لگائی تھی۔

آیئے اب ان سب کے متعلق سحرالبیان کے کچھ اشعار کا مطالعہ کریں:

☆زبان کی سادگی اور صفائی:

وہ بیٹھی عجب ایک انداز سے بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
پسینہ پسینہ ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن

☆صنعتوں کا استعمال: (تجنیس)

کیا چاہ وا ، ہیں یوسف عزیز — اری باؤلی چاہ میں کر تمیز
نہا دھو کے اُس روز ایسی بنی — کہ دو دن کی سچ مچ ہو جیسے بنی

☆محاکات:

کہ زانو پہ اک پاؤں کو رکھ لیا — اور اک پاؤں مونڈھے سے لٹکا دیا

☆محاورہ یا ضرب الامثال:

کسی پاس دولت یہ رہتی نہیں — سدا ناؤ کاغذ کی بہتی نہیں

☆تشبیہات:

نہانے میں یوں تھی بدن کی چمک — ہر سینے میں بجلی کی جیسے چمک

مندرجہ بالا خصوصیات کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی اردو ادب کی بے مثل مثنوی ہے۔ جس میں سادگی، پرکاری، فن کارانہ نزاکت، منظر کشی، تصویر کشی، واقعہ نگاری، مکالمہ نگاری، کردار نگاری کی نادر مثالیں موجود ہیں۔ میر حسن کے شاعرانہ انداز بیان، طرزِ ادا اور ان کی زبان پر قدرت نے مثنوی کو حیاتِ جاوداں بخش دی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے درست کہا ہے:

''واقعہ یہ ہے کہ اس تصنیف میں میر حسن نے اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔ اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اپنی ذہانت و فطانت، فنی آگہی و لسانی شعور کا ثبوت اس مثنوی کے ہر مصرعے سے فراہم ہے۔ یہ کہانی نہیں تہذیبی دستاویز ہے۔ یہ شعر نہیں صحیفۂ حیات ہے۔''

06.07 مثنوی ''سحر البیان'' انتخاب (آغاز داستان) متن

☆

مثنوی ''سحر البیان'' انتخاب

کسی شہر میں تھا کوئی بادشاہ — کہ تھا وہ شہنشاہِ گیتی پناہ
بہت حشمت و جاہ و مال و منال — بہت فوج سے اپنی فرخندہ حال
کئی بادشاہ اُس کو دیتے تھے باج — خطا اور خُتن سے وہ لیتا خراج
کوئی دیکھتا آ کے جب اُس کی فوج — تو کہتا کہ ہے بحرِ ہستی کی موج
طویلے کے اُس کے جو ادنیٰ تھے خر — اُنہیں نعل بندی میں ملتا تھا زَر
جہاں تک کہ سرکش تھے اطراف کے — وہ اُس شہ کے رہتے تھے قدموں لگے
رعیت تھی آسودہ و بے خطر — نہ غم مفلسی کا، نہ چوری کا ڈر

عجب شہر تھا اُس کا مینو سواد
کہ قدرت خدائی کی آتی تھی یاد

لگے تھے ہر اِک جا پہ واں سنگ و خشت
ہر اِک کوچہ اُس کا تھا رشکِ بہشت

زمیں سبز و سیراب عالَم تمام
نظر کو طراوت وہاں صبح و شام

کہیں چاہ و منبع، کہیں حوض و نہر
ہر اِک جا پہ آبِ لطافت کی لہر

عمارت تھی گچ کی وہاں بیش تر
کہ گزرے صفائی سے جس پر نظر

کروں اُس کی وسعت کا کیا مَیں بیاں
کہ جوں اِصفہاں تھا وہ نصفِ جہاں

ہنرمند واں اہلِ حرفہ تمام
ہر اِک نوع کی خلق کا ازدحام

جہاں تک کہ رستے تھے بازار کے
کہے تُو کہ تختے تھے گلزار کے

یہ دل چسپ بازار تھا چوک کا
کہ ٹھہرے جہاں، بس وہیں دل لگا

وہ پختہ دُکانوں کے دیوار و در
سفیدی پہ جن کی نہ ٹھہرے نظر

صفا پر جو اُس کی نظر کر گئے
اُسے دیکھ کر، سنگ مَر مَر گئے

کہوں قلعے کی اُس کے مَیں کیا شکوہ
گئے دَب بلندی کو دیکھ اُس کی کوہ

وہ دولت سرا، خانۂ نور تھا
سدا عیش و عشرت سے مامور تھا

ہمیشہ خوشی، رات دن سیرِ باغ
نہ دیکھا کسی دل پہ جز لالہ داغ

سدا عیش و عشرت، سدا راگ و رنگ
نہ تھا زیست سے اپنی کوئی بہ تنگ

غنی واں ہوا جو کہ آیا تباہ
عجب شہر تھا وہ، عجب بادشاہ

نہ دیکھا کسی نے کوئی واں فقیر
ہوئے اُس کی دولت سے گھر گھر اَمیر

کہاں تک کہوں، اُس کا جاہ و حشم
محل و مکاں اُس کا رشکِ اِرم

سدا ماہ رُویوں سے صحبت اُسے
سدا جامہ زیبوں سے رغبت اُسے

ہزاروں پری پیکر اُس کے غلام
کمربستہ خدمت میں حاضر مدام

کسی طرُف سے وہ نہ رکھتا تھا غم
مگر ایک اولاد کا تھا اَلَم

اِسی بات کا، اُس کے تھا دل پہ داغ
نہ رکھتا تھا وہ اپنے گھر کا چراغ

دنوں کا عجب اُس کے یہ پھیر تھا
کہ اُس روشنی پر یہ اندھیر تھا

وزیروں کو اِک روز اُس نے بُلا
جو کچھ دل کا احوال تھا، سو کہا

کہ مَیں کیا کروں گا یہ مال و منال
فقیری کا ہے میرے دل کو خیال

فقیر اب نہ ہوں تو کروں کیا علاج؟
نہ پیدا ہوا وارثِ تخت و تاج

جوانی مِری ہو گئی سب بسر نمودار پیری ہوئی سر بسر
دریغا کہ عہدِ جوانی گزشت جوانی مگو ، زندگانی گزشت
بہت ملک پر جان کھویا کیا بہت فکرِ دنیا میں رویا کیا
زہے بے تمیزی و بے حاصلی کہ از فکرِ دنیا زِ دیں غافلی
وزیروں نے کی عرض اے آفتاب ! نہ ہو تجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب
فقیری جو کی ہے تو دنیا کے ساتھ نہیں خوب جانا اُدھر خالی ہاتھ
کرو سلطنت لے کے اعمالِ نیک کہ تا دوجہاں میں رہے حالِ نیک
جوعاقل ہوں وہ سوچ میں ٹک رہیں کہ ایسا نہ ہووے کہ پھر سب کہیں
''تُو کارِ زمیں را نکو ساختی کہ بر آسماں نیز پرداختی''
یہ دنیا جو ہے مزرعِ آخرت فقیری میں ضائع کرو اِس کو مت
عبادت سے اِس کِشت کو آب دو وہاں جا کے خرمن ہی تیار لو
رکھو یاد عدل و سخاوت کی بات کہ اِس فیض سے ہے تمہاری نجات
مگر ہاں، یہ اولاد کا ہے جو غم سو اِس کا تردد بھی کرتے ہیں ہم
عجب کیا ہے ہووے تمہارے خلف کرو تم نہ اوقات اپنی تلف
نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو کہ قرآں میں آیا ہے لاتقنطوا
بلاتے ہیں ہم اہلِ تنجیم کو نصیبوں کو اپنے ذرا دیکھ لو
تسلّی تو دی شاہ کو اِس نَمط ولے اہلِ تنجیم کو بھیجے خط
نجومی و رمّال اور برہمن غرض یاد تھا جن کو اِس ڈھب کا فن
بُلا کر اُنہیں شہ کنے لے گئے جوں ہی روبرو شہ کے سب وے گئے
پڑا جب نظر وہ شہِ تاج و تخت دعا دی کہ ہوں شہ کے بیدار بخت
کیا قاعدے سے نہُڑ کر سلام کہا شہ نے مَیں تم سے رکھتا ہوں کام
نکالو ذرا، اپنی اپنی کتاب مِرا ہے سوال، اُس کا لکھو جواب
نصیبوں میں دیکھو تو میرے کہیں کسی سے بھی اولاد ہے یا نہیں؟
یہ سن کر وہ رمّالِ طالع شناس لگے کھینچنے زائچے بے قیاس
دَھرے تختے آگے، لیا قرعہ ہاتھ لگا دھیان اولاد کا اُس کے ساتھ

جو پھینکیں تو شکلیں کئی بیٹھیں مِل — کئی شکل سے دل گیا اُن کا کِھل
جماعت نے رمّال کی عرض کی — کہ ہے گھر میں اُمید کی کچھ خوشی
یہ سُن ہم سے اے عالموں کے شفیق! — بہت ہم نے تکرار کی ہر طریق
بیاض اپنی دیکھی جو اِس رَمل کی — توایک ایک نقطہ ہے فردِ خوشی
ہے اِس بات پر اجتماعِ تمام — کہ طالع میں فرزند ہے تیرے نام
زن و زوج کے گھر میں ہے گی فرح — پیا کر مئے وصل کا تُو قدح
نجومی بھی کہنے لگے در جواب — کہ ہم نے بھی دیکھی ہے اپنی کتاب
نحوست کے دن سب گئے ہیں نکل — عمل اپنا سب کر چکا ہے زُحل
ستارے نے طالع کے بدلے ہیں طَور — خوشی کا کوئی دن میں آتا ہے دَور
نظر کی جو تسدیس و تثلیث پر — تو دیکھا کہ ہے نیک سب کی نظر
کیا پنڈتوں نے جو اپنا بچار — تو کچھ انگلیوں پر کیا پھر شمار
جنم پتّرا شاہ کا دیکھ کر — تُلا اور برچھک پہ کر کر نظر
کہا: رام جی کی ہے تم پر دَیا — چندرماں سا بالک ترے ہوئے گا
مہاراج کے ہوں گے مقصد شتاب — کہ آیا ہے اَب پانچواں آفتاب
نکلتے ہیں اب تو خوشی کے بچن — نہ ہو گر خوشی تو نہ ہوں برہمن
نصیبوں نے کی آپ کے، یاوری — کہ آئی ہے اب ساتویں مشتری
مقرر ترے چاہیے ہو پسر — کہ دیتی ہے یوں اپنی پوتھی خبر
و لیکن مقدر ہے کچھ اور بھی — کہ ہیں اِس بھلے میں بُرے طور بھی
یہ لڑکا تو ہوگا، ولے کیا کہیں — خطر ہے اُسے بارہویں برَس میں
نہ آئے یہ خورشید بالائے بام — بلندی سے خطرہ ہے، اِس کو تمام
نہ نکلے یہ بارہ برس رشکِ مہ — رہے برج میں یہ مہِ چاردَہ
کہا: سن کے شہ نے یہ اُن کے تئیں — کہو، جی کا خطرہ تو اُس کو نہیں
کہا: جان کی ہر طرح خیر ہے — مگر دشتِ غربت کی کچھ سیر ہے
کوئی اُس پہ عاشق ہو جن و پری — کوئی اُس کی معشوق ہو اِستری
کچھ ایسا نکلتا ہے پوتھی میں اب — خرابی ہو اُس پر کسی کے سبب

ہوئی کچھ خوشی شہ کو اور کچھ اَلَم — کہ دنیا میں تو اَم ہیں شادی و غم
کہا: شہ نے اِس پر نہیں اعتبار — جو چاہے کرے میرا پروردگار
یہ فرما: محل میں درآمد ہوئے — منجم وہاں سے برآمد ہوئے
خدا پر زبس اُس کو تھا اعتقاد — لگا مانگنے اپنی حق سے مراد
خدا سے لگا کرنے وہ التجا — لگا آپ مسجد میں رکھنے دِیا
نکالا مُرادوں کا آخر سراغ — لگائی اُدھر لَو تو پایا چراغ
سحابِ کرم نے کیا جو اَثر — ہوئی کِشت اُمید کی باروَر
اُسی سال میں یہ تماشا سنو — رہا حمل اِک زوجۂ شاہ کو
جو کچھ دل پر گزرے تھے رنج و تعب — مبدل ہوئے وے خوشی ساتھ سب

ختم شد

06.08 مثنوی ''سحرالبیان'' انتخاب (آغاز داستان) تشریح

کس شہر میں تھا کوئی بادشاہ.....کمر بستہ خدمت میں حاضر مدام

یہ اشعار مثنوی کی اِبتدا بعنوان آغازِ داستان سے متعلق ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار میں سے چند اشعار کی تشریح کی جارہی ہے جس میں میر حسن نے داستان میں بیان بادشاہ، اس کی رعیت اور اس کے دور حکومت کی خوش حالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی شہر میں ایک بادشاہ جو نہایت جاہ وجلال اور پناہ میں لینے والا تھا۔ جس کی حکومت ایسی با نشان تھی کہ بڑے بڑے بادشاہ بھی اس کو خراج (ٹیکس) ادا کرتے تھے۔ یعنی اس کے زیر سایہ تھے۔ اس کی رعایا کو ہر طرح کے اطمینان وسکون اور راحت وآرام میسر تھے۔ دولت کی فراوانی اتنی تھی کہ گھوڑوں کی نعل بندی لوہے سے نہیں بلکہ سونے ہوتی تھی۔ شہر کا یہ عالم تھا کہ اس کی خوب صورتی سرسبز اور شادابی، عمارتوں کی بلندی، حوض ونہر، باغات وغیرہ ایسے تھے کہ جنت کا گمان ہوتا تھا شہر کی ہر چیز کو دیکھ کر خدا کی قدرت یاد آجاتی تھی۔ شہر کے ساتھ اہل شہر بھی تمام علوم وفنون میں ہنرمند تھے۔ گلی، راستے، چوک اور بازار نہایت دل چسپ اور دل فریب تھے۔ گویا کہ گلزار کے تختے ہوں۔

ہر مکان پکا اور ایسا صاف ستھرا کہ اس کی سپیدی پر نظر نہ ٹھہرے اور قلعے ایسے کہ ان کی بلندی کے آگے پہاڑ کی قامت شرما جائے۔ ایسی روشنی کہ عیش وعشرت نے اپنے قدم یہیں جما دیئے۔ ایسی دولت کدہ اور عیش ونشاط کا گہوارہ کہ جس کا مقابل کوئی دوسرا شہر نہ تھا۔ ایسا شہر جہاں نادار بھی آکر دولت مند ہوجائے۔ فقیر اور مفلسی کا تو نام بھی نہ تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اس شہر کی کیا کیا خوبیاں اور جاہ حشم کا بیان کروں۔ بس ایسا تھا ہر گھر اور محل پر جنت کے مکان ومحلات رشک کریں۔ بادشاہ کی خدمت کے لئے خوب صورت کنیزیں اور خواص وخادمائیں ہمہ وقت تیار رہتیں اور وہ ان کی صحبت میں عیش وعشرت کے ساتھ اپنا وقت گزارتا۔ مثل پری اور حوروں کے اس کی فرماں بردار نازنین اس کی غلامی میں ہمہ وقت مصروف رہتیں۔

نوٹ:۔ میر حسن جس شہر کا یہ نقشہ کھینچا ہے وہ فیض آباد اور لکھنؤ ہیں۔

06.09 خلاصہ

میر حسؔن ۱۷۳۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام میر ضاحکؔ تھا۔تعلیم وتربیت دہلی میں ہوئی۔والد کے علاوہ خواجہ میر دردؔ،سوداؔ اور ضیاءؔ سے شاعری کے فن سیکھے۔جوانی میں ہی والد کے ساتھ فیض آباد چلے آئے اور پھر لکھنؤ،فیض آباد دونوں جگہ قیام کیا۔دربار تک رسائی حاصل کی اور دربار سے وظیفہ بھی پایا۔۱۷۸۸ء میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور قاسم علی خاں کے باغیچہ میں دفن ہوئے۔میر حسن نے کئی یادگار تصانیف چھوڑی ہیں۔شاعری کے علاوہ انہوں نے ایک تذکرہ بھی بھی ''تذکرۂ شعرائے اردو'' کے نام سے تحریر کیا۔ان کی پہلی مثنوی ''مثنوی شادی آصف الدولہ'' ہے۔انہوں نے کل بارہ مثنویاں تحریر کیں۔

سحر البیان ان کی آخری تصنیف ہے جو ۱۷۸۴ء میں تحریر کی گئی۔میر حسن نے مثنویوں کے علاوہ غزل گوئی میں بھی طبع آزمائی کی۔ان کی غزلیں سادگی،دل فریبی اور عاشقانہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔انہوں نے چند قصائد بھی لکھے۔مرثیہ اور رباعیوں پر بھی زورِ قلم صرف کیا۔میر حسؔن کی شاہ کار تخلیق ان کی مثنوی سحر البیان ہے جو اردو ادب میں ایک نادر نمونہ کہلاتی ہے۔یہ مثنوی اپنے عہد کی سماجی،معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔اس میں دہلوی زبان کی سادگی،صفائی،سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔اس مثنوی کا پلاٹ کچھ کمزور ہے۔مختلف قصوں کو یکجا کر اس کو ترتیب دیا گیا ہے۔جب کہ کردار نگاری،منظر نگاری،جذبات نگاری،مکالمہ نگاری اور تہذیب وثقافت کی عکاسی میں اس کا جواب نہیں۔اس کا اسلوب بہترین ہے اور زبان وبیان سے متعلق تمام فن کاری اس میں پائی جاتی ہے۔

اس کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہا ہے کہ

> ''واقعہ یہ ہے کہ اس تصنیف میں میر حسن اپنا خونِ جگر صرف کیا ہے۔اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔اپنی ذہانت وفطانت فنی آگہی ولسانی شعور کا ثبوت اس مثنوی ہر مصرعے سے فراہم ہے۔یہ کہانی نہیں تہذیبی دستاویز ہے۔یہ شعر نہیں صحیفۂ حیات ہے۔''

اور پوری مثنوی کے مطالعے سے یہ سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔بہر حال یہ مثنوی اردو ادب میں رہتے دور تک قائم رہے گی۔

06.10 فرہنگ

استری	: عورت	زحل	: ایک ستارہ جو نحس خیال کیا جاتا ہے۔(سنیچر)
اضطراب	: بے چینی،بے قراری	سحاب	: بادل،ستاروں کا دھندلا گچھا (گیلیکسی)
باج	: خراج،ٹیکس	سوانحی خاکہ	: زندگی سے متعلق معلومات
بخت	: قسمت،نصیب	شاہ کار	: بڑا کام،عظیم تخلیق،منفرد کارنامہ
بیاض	: وہ کتاب جس میں شعر لکھتے ہیں،یادداشت کی کاپی	طراوت	: تازگی،ٹھنڈک
		قرعہ	: نام کی پرچی نکالنا
پسر	: لڑکا،بیٹا	کھیت	: کھیت،کھلیان
پیری	: بڑھاپا،کمزوری	گیتی	: دنیا،عالم

تثلیث : تین حصوں میں تقسیم کرنا نجومیوں کی اصطلاح میں تیسرے گھر کے ستارے کا پہلے گھر کو دیکھنا

تردّد : سوچ، فکر، اندیشہ

تسدیس : چھ حصوں میں تقسیم کرنا دو سیاروں کا مظہر جب ان کا فاصلہ ۶۰ درجہ کا ہو

خر : گدھا، بے وقوف آدمی

زائچہ : وہ کاغذ جو نجومی بچے کی پیدائش کے وقت بناتے ہیں

متحرک : حرکت کرنے والا

مزرع : کھیتی

مکالمہ : بات چیت، گفتگو

منجّم : نجومی، ستاروں کا علم جاننے والا

نمط : وضع قطع، شکل وصورت، روش

ہالہ : روشنی جو آفتاب کے اردگرد دکھائی دیتی ہے، چاند کا ہالا

06.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ سحر البیان کی منظر نگاری پر چند جملے تحریر کیجیے؟

سوال نمبر۲ سحر البیان کی مکالمہ نگاری مع مثال بیان کیجیے؟

سوال نمبر۳ سحر البیان کی اسلوبیاتی خصوصیات پر رائے دیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ میر حسن کا سوانحی خاکہ بیان کیجیے؟

سوال نمبر۲ میر حسن کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے؟

سوال نمبر۳ سحر البیان کی کردار نگاری پر تنقیدی رائے دیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : ''قصائد'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) قصیدہ (ب) قصد (ج) قاصد (د) قصداً

سوال نمبر۲ : ''سحر البیان'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) جادو (ب) جادو بیانی (ج) بیان (د) بیانات

سوال نمبر۳ : ''ہنر مند'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) جاہل (ب) بے وقوف (ج) بے ہنر (د) اَن پڑھ

سوال نمبر۴ : مثنوی ''سحر البیان'' کے ہیرو کا نام کیا ہے؟

(الف) نظر (ب) نذیر (ج) نظیر (د) بے نظیر

سوال نمبر۵ : مثنوی ''سحرالبیان'' کی ہیروئن کا نام کیا ہے؟

(الف) بکاؤلی (ب) بدرِمنیر (ج) حُسن آرا (د) مہتاب پری

سوال نمبر۶ : بدرِمنیر اور نجم النسا میں کیا رشتہ ہے؟

(الف) بہن کا (ب) ماں بیٹی کا (ج) چچی بھتیجی کا (د) شہزادی اور کنیز کا

سوال نمبر۷ : مثنوی سحرالبیان کس دبستان کی نمائندگی کرتی ہے؟

(الف) دکن (ب) دبستانِ عظیم آباد (ج) دبستانِ دہلی (د) دبستانِ لکھنؤ

سوال نمبر۸ : ''ماہ رُخ'' کیا ہے؟

(الف) جانور (ب) انسان (ج) جن (د) پَری

سوال نمبر۹ : ''گلزارِارم'' کس کی مثنوی ہے؟

(الف) میر سوز (ب) میر حسن (ج) میر تقی میر (د) میر ضاحک

سوال نمبر۱۰ : ''میر انیس اور میر حسن میں کون سا رشتہ ہے؟

(الف) ماموں، بھانجے کا (ب) چچا، بھتیجے کا (ج) دادا، پوتے کا (د) باپ، بیٹے کا

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) قصیدہ

جواب نمبر۲ : (ب) جادو بیانی

جواب نمبر۳ : (ج) بے ہنر

جواب نمبر۴ : (د) بے نظیر

جواب نمبر۵ : (ب) بدرِمنیر

جواب نمبر۶ : (د) شہزادی اور کنیز کا

جواب نمبر۷ : (ج) دبستانِ دہلی

جواب نمبر۸ : (د) پَری

جواب نمبر۹ : (ب) میر حسن

جواب نمبر۱۰ : (ج) دادا، پوتے کا

06.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۲۔ اردو مثنوی کا اِرتقا از عبدالقادر سروری

۳۔ مثنوی سحرالبیان از مرتبہ پروفیسر رشید احمد خاں

۴۔ اردو مثنوی کا اِرتقا از پروفیسر عقیل احمد رضوی

اکائی 07 پنڈت دیا شنکر نسیم: مثنوی گلزارِ نسیم

ساخت

07.01 : اغراض ومقاصد

07.02 : تمہید

07.03 : پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی حالاتِ زندگی

07.04 : مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کی خصوصیات

07.05 : مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کی دیگر خصوصیات

07.06 : مثنوی ''گلزارِ نسیم'' انتخاب: متن

07.07 : مثنوی ''گلزارِ نسیم'' انتخاب: تشریح

07.08 : خلاصہ

07.09 : فرہنگ

07.10 : نمونہ امتحانی سوالات

07.11 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے اغراض ومقاصد آپ کو اردو کی بڑی اور اہم مثنوی ''گلزارِ نسیم'' اور اس کے تخلیق کار پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی حیات وشخصیت سے واقف کرانا ہے۔ پچھلی اکائی میں آپ نے عظیم مثنوی نگار میر حسن اور ان کی مثنوی سحر البیان کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ اِس اکائی کے تحت آپ پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی سوانح، ان کی مثنوی گلزارِ نسیم کی خصوصیات کا مطالعہ کریں گے۔ ساتھ ہی مثنوی کے انتخابی متن کو آپ پڑھیں گے۔ جس کے چند اشعار کی تشریح آپ کے مطالعہ کے لئے پیش کی جائے گی۔ مشکل الفاظ کی فرہنگ اور نمونہ امتحانی سوالات ہوں گے۔ معاون اور حوالہ جاتی کتب کی فہرست بھی دی جائے گی جن کے مطالعے سے آپ اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

اکائی کے مطالعے کے دَوران آپ نے جو کچھ سمجھا اس سے متعلق اپنی معلومات کی جانچ کے تحت سوالات پوچھے جائیں گے اور آخر میں ان کے جواب بھی ملاحظہ کریں گے۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد امید قوی ہے کہ آپ اردو کی سب سے اہم مثنویوں میں شمار اس مثنوی اور اس کے تخلیق کار کے بارے میں اچھی طرح جان پائیں گے۔

07.02 تمہید

مثنویوں کا تعلق قصوں اور داستانوں سے جڑا ہوا ہے۔اس میں شاعر کو اپنی جولانیِ طبع اور استعداد و قابلیت کے جوہر دکھانے کے مکمل مواقع ملتے ہیں اس میں ہر طرح مضامین کو بیان کرنے کی گنجائش رہتی ہے۔اردو میں ابتدائی دور سے مثنویاں پائی جاتی ہیں۔اس صنف کی اِبتدا دکن سے ہوتی ہے اور شمال میں اس کو عروج حاصل ہوتا ہے۔شمالی ہند میں افضلؔ، میرؔ، سوداؔ، میر ضاحکؔ اور میر حسن وغیرہ نے مثنوی کو بامِ عروج پر پہچانے میں اہم کردار ادا کیا۔اردو کی جو دو سب سے بہترین مثنویاں مانی جاتی ہیں وہ ہیں سحر البیان اور گلزارِ نسیم دونوں کو اپنی اپنی خوبیوں کی بنا پر ایک دوسرے کے مدمقابل رکھا جاتا ہے۔گلزارِ نسیم لکھنوی دبستان کا شاہ کار ہے اس میں لکھنوی اندازِ شاعری کی تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔اس مثنوی کے تخلیق کار پنڈت دیا شنکر نسیمؔ نے گویا لکھنوی انداز میں اپنی مثنوی لکھ کر سحر البیان کی خوبیوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔آیئے اب اس مثنوی کے تخلیق کار اور اس مثنوی کی خوبیوں کا مطالعہ کریں۔

07.03 پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کی حالاتِ زندگی

دیا شنکر نسیمؔ کے عہد کا لکھنؤ علم و ادب کا مرکز تھا۔دہلی تباہ و برباد ہو چکی تھی مگر لکھنؤ کی رونق اپنے شباب پر تھی۔اَودھ کے حکمرانوں کے چرچے عام تھے۔لکھنؤ عیش پرستی اور ادبی محفل کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔شعرا ملک کے دیگر حصوں سے اس وقت لکھنؤ آ رہے تھے اور یہ شعرا اپنا کلچر اپنی تہذیب و ثقافت اور زبان بھی ساتھ لا رہے تھے جس نے لکھنوی فضا کی ادبی فضا کو معطر کر دیا تھا۔باوجود اس کے لکھنؤ کا مزاجِ شاعری اپنا الگ رنگ اختیار کیے ہوئے تھا۔نئے اسالیب میں غزل قصیدہ اور مثنویاں لکھی جاری تھیں۔دیا شنکر نسیمؔ نے بھی اپنے عہد کے خاص لکھنوی رنگِ سخن کو قبول کرتے ہوئے اپنی مثنوی گلزارِ نسیم تحریر کی۔آیئے پہلے اس عظیم شاعر کے بارے میں جانتے ہیں۔

نسیم کا پورا نام پنڈت دیا شنکر کول تھا۔نسیمؔ تخلص اختیار کیا۔۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدائش ہوئی۔والد کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔نسیم کے آباء واجداد کشمیری برہمن تھے لیکن عرصہ قبل وہ ترکِ وطن کر لکھنؤ آ گئے۔یہیں نسیم کی پرورش و پرداخت ہوئی۔انہوں نے لکھنؤ میں ہی اردو اور فارسی کی تعلیم حاصل کر ان زبانوں پر دَست رَس حاصل کی۔ذہن اِبتدا ہی سے شاعری کی طرف مائل تھا۔طبیعت کے اسی شوق نے شعرائے اردو کے کلام کی جانب راغب کیا۔لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں شامل ہونے لگے۔شاعری کی شروعات دیگر شعرا کی طرح غزل گوئی سے کی۔

نسیم کی شاعری کا دور آتشؔ اور ناسخؔ کے زمانے کا دور ہے۔لکھنؤ کے شعری دبستان میں ان دونوں استاد شعرا کا طوطی بول رہا تھا۔نسیم نے طبیعت کے موافق آتشؔ کی شاگردی اختیار کرنے کا من بنایا اور آتشؔ کو استاد تسلیم کر ان کے زیرِ سایہ شاعری کے زانوئے ادب طے کرنے لگے۔ابتدائی منزلیں طے کرتے ہوئے لگ بھگ بیس سال کی عمر میں شاعری کے فن میں مہارت حاصل کر لی اور مشاعروں میں شرکت کر اپنی طبع معنی آفرینی کے جوہر دکھانے لگے۔

نسیم کو غزل سے مناسبت تو تھی ہی پر میر حسن کی سحر البیان کے چرچے بھی سن رہے تھے اس لئے مثنوی کی جانب رجحان بڑھا۔شاید مزاج سے مناسبت ہونے کی وجہ سے صنفِ مثنوی کی جانب خاطر خواہ توجہ دی۔اردو اور فارسی میں اس وقت بیشمار داستانیں موجود تھیں۔میر امّن کی باغ و بہار بھی آ چکی تھی۔لہٰذا نسیم کو اپنی مثنوی کے لئے قصے کے انتخاب میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔انہوں نے قصہ ''گل بکاؤلی'' کا انتخاب کیا اور اس کو مثنوی کے فارم میں نہایت فن کارانہ مہارت کے ساتھ نظم کر ڈالا۔شروع میں یہ مثنوی کافی بڑی تھی۔اپنے استاد آتشؔ کے مشورے پر انہوں نے اس کو اتنا مختصر کیا کہ اختصار اس کی سب سے بڑی خوبی قرار پائی۔

نسیم قادرالکلام شاعر تھے۔ان کی قادرالکلامی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے مذکورہ جاوداں مثنوی صرف اٹھائیس سال کی عمر میں ۱۸۴۴ء میں تخلیق کی۔اس کے علاوہ چند ایک واقعات درج کیے جاتے ہیں جن سے ان کی قادرالکلامی اور زود گوئی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

ناسخ کا شمار لکھنؤ کے استاد شعرا میں ہوتا ہے انہوں نے نسیم سے ۔

شیخ نے مسجد بنا مسمار بت خانہ کیا

پر مصرع لگانے کو کہا۔نسیم نے برجستہ کہا

تب تو اک صورت بھی تھی اب صاف ویرانہ کیا

اسی طرح کا ایک واقعہ چکبست گلزارِنسیم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ دہلی سے تین مصرعے امتحاناً لکھنؤ بھیجے گئے کہ شعرائے لکھنؤ ان پر مصرع لگا کر بھیجیں۔اب اہلِ لکھنؤ کی یہ کوشش ہوئی کہ ایسے مصرعے کہہ کر بھیجے جائیں کہ دہلی والوں کو بھی یہاں کی شاعری کا قائل ہونا پڑے۔''

☆

ناسخ کو ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

آتش کو اِس لئے قبر میں رکھا اِنہیں زنجیر سمیت

اور نسیم کو من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دَیر

مصرعے دیے گئے۔بہرحال تینوں نے حسبِ ذیل مصرعے لگائے۔

ناسخ نے : دے دوپٹہ تو اپنا ململ کا ناتواں ہوں کفن بھی ہو ہلکا

آتش نے : حشر میں حشر نہ برپا کریں یہ دیوانے اِس لئے قبر میں رکھنا اِنہیں زنجیر سمیت

نسیم نے : دارم زدین و کفر بہر یک قدم دو سیر من می روم بہ کعبہ و دل می رود بہ دَیر

نسیم کا پشتینی تعلق اگرچہ کشمیر سے تھا مگر عام کشمیریوں کی طرح ان کا رنگ اور ناک ونقش نہ تھے۔

بقول چکبست:

''پستہ قامت، گندمی رنگ، سیہ چشم اور چھریرے بدن کے آدمی تھے۔سلسلہ معاش یہ تھا کہ شاہی فوج میں وکیل تھے۔''

رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے:

''بعہد امجد علی شاہ بادشاہ اَوَدھ فوج میں بخشی گری کے عہدے پر مامور تھے۔''

اس طرح شاہی دربار میں فوج کی تنخواہ بانٹنے کے کام پر مامور تھے۔سارا حساب کتاب رکھتے تھے۔مصرف زیادہ نہ تھے اس لئے ملنے والی تنخواہ میں اچھی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی اگرچہ عہدہ معمولی تھا مگر طبیعت میں صبر وقناعت واستغناء تھی۔اصول پرست زندگی گزارنے

کی وجہ سے خوش حال زندگی بسر کی۔ شاہی دربار تک رسائی ہونے کے باوجود کبھی بھی مفاد حاصل کرنے کی غرض سے مدح سرائی نہ کی۔ بادشاہ وقت کی شان میں نہ قصیدہ کہا اور نہ اشعار قلم بند کیے۔ ہمیشہ اپنی وضع کی پاسداری کی اور شانِ استغناء کو قائم رکھا۔

اس سلسلے میں چکبستؔ لکھتے ہیں:

''نسیم کے مزاج میں آزادی اور بے باکی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کبھی مال و دولت کی تمنّا نہ کی گو کہ بہت اہلِ کشمیر اس زمانے میں عہد ہائے جلیلہ پر ممتاز تھے اور دربارِ شاہی میں ان لوگوں کی رسائی تھی۔ ان حضرات نے کئی مرتبہ نسیم سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ان کو دربارِ شاہی تک پہنچائیں اور ان کے منصب و جاگیر کی فکر کریں مگر شہنشاہِ سخن نے دوات و قلم کو طبل و عَلَم پر ترجیح دی۔''

نسیم بڑے بذلہ سنج اور ظریف انسان تھے۔ ذہن اور ذکاوتِ طبع کا عجب عالم تھا۔ حاضر جوابی بلا کی تھی۔ ان تمام خوبیوں نے ان کو اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز کر دیا تھا۔ نسیم نے اپنے استاد آتشؔ کو ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا۔ استاد اور شاگرد کے درمیان کہیں کہیں چشمک کا بھی ذکر پایا جاتا ہے مگر اس پر اعتبار مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ایک فرماں بردار شاگرد ہونے کا ثبوت دیا ہے اور استاد کے مشورہ کو بے چون و چرا مانتے ہوئے اپنی مثنوی کا آپریشن کر ڈالا اور سیکڑوں اشعار قلم زد کر دیئے۔ استاد کے دیگر شاگردوں میں مثلاً مہرؔ، وزیرؔ، بحرؔ، جلالؔ، امانتؔ، شوقؔ وغیرہ میں نسیم کے تعلقات صباؔ سے بہت اچھے تھے لیکن رندؔ سے ان کی نوک جھونک ہو جاتی تھی۔ اس نوک جھونک کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ نسیمؔ اکثر رندؔ کے اشعار پر مصرع لگا دیتے تھے۔ جس سے شعر اور جان دار بن جاتا تھا جس کا کریڈٹ نسیم کو جاتا۔ ایک بار یہ نوک جھونک اتنی بڑھ گئی کہ رندؔ نے سرِ مشاعرہ تلوار کھینچ لی اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن نسیم ثابت قدم رہے اور بات کو آگے نہ بڑھنے دیا۔

گلزارِ نسیم کی طباعت ۱۲۶۰ھ میں عمل میں آئی اور اس کی طباعت کے تقریباً ایک سال بعد ہی ہیضہ کی بیماری کی وجہ سے لگ بھگ ۳۴ رسال کی عمر میں ۱۸۴۵ء مطابق ۱۲۶۱ھ میں نسیم کا انتقال لکھنؤ میں ہو گیا اور اپنے اس شعر کے مصداق بنے:

روحِ رواں و جسم کی صورت میں کیا کہوں
جھونکا ہوا کا تھا، اِدھر آیا، اُدھر گیا

نسیم کے سب سے عزیز دوست صباؔ نے ان کی وفات پر یہ شعر کہا:

اُٹھ گئے ہیں نسیمؔ جس دن سے
اے صباؔ وہ ہوائے باغ نہیں

اپنی موت سے پہلے اور سب سے آخری شعر میں نسیم نے یہ کہا تھا:

پہنچی نہ راحت ہم سے کسی کو بلکہ اذیت کوش ہوئے
جان پڑی تب بار شکن تھے، مَر کے بال و دوش ہوئے

مثنوی کے علاوہ نسیم کی تصانیف میں ایک مختصر سا غزلوں کا دیوان ہے جو چھپ چکا ہے۔

07.04 مثنوی ''گلزارِنسیم'' کی خصوصیات

اُردو مثنوی نگاری کی تاریخ میں جن دو مثنویوں کا نام سرِ فہرست آتا ہے ان میں ایک نام پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارِنسیم کا ہے یہ مثنوی ہند ایرانی مشترکہ تہذیب کی عمدہ مثال ہے کہ اس مثنوی میں گل بکاؤلی کی قصے کو نظم کیا گیا ہے۔گل بکاؤلی کا قصہ اصلاً ہندوستانی ہے مگر اس میں مختلف کہانیوں کے عناصر ملتے ہیں۔اس قصہ کو عزت اللہ بنگالی نے فارسی زبان میں تحریر کیا تھا۔جس کو بعد میں فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمائش پر منشی نہال چند لاہوری نے ۱۸۰۳ء میں اس کو اردو نثر میں مذہبِ عشق کے نام سے ترجمہ کیا۔اس قصہ نے بہت شہرت پائی اور نسیم نے اپنی مثنوی گلزارِنسیم کے لئے اسی قصہ کو منتخب کیا اور اس کو نہایت فنی چابک دستی سے مثنوی کے فارم میں نظم کر دیا۔

گلزارِنسیم کی اہم خوبیوں کو ہم ذیل میں تحریر کرتے ہیں

﴿پلاٹ﴾:۔گلزارِنسیم کا پلاٹ پیچیدہ پلاٹ ہے۔اس میں کئی ضمنی قصے بھی جوڑے گئے ہیں۔اصل قصہ بادشاہ زین الملوک اور اس کے بیٹوں سے متعلق ہے۔بادشاہ کے چار بیٹے ہوتے ہیں۔پانچویں بیٹے کی پیدائش پر پیشین گوئی ہوتی ہے کہ اگر بادشاہ نے اپنے اس پانچویں بیٹے کو دیکھ لیا تو اس کی بینائی جاتی رہے گی۔اتفاقاً ایک دن بادشاہ کی نظر اپنے اس بیٹے پر پڑ جاتی ہے اور وہ اندھا ہو جاتا ہے۔بینائی کو واپس لانے کے لئے شہزادہ گل بکاؤلی پھول کی تلاش میں جاتا ہے اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے پھول کو حاصل کر والد کی بینائی واپس لے آتا ہے۔اس قصہ کے ساتھ ساتھ راجہ اندر اور چتر اوت اس کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں جس سے مختلف واقعات ظہور میں آتے ہیں۔

قصہ میں استعاراتی انداز پایا جاتا ہے جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہر طرح کی دشواریاں برداشت کرنی چاہیے اگر وہ ثابت قدم رہ کر لگاتار جہد و عمل میں لگا رہے تو لازمی طور پر کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔بہر حال اس چھوٹے سے قصے میں بادشاہ، شہزادہ، شہزادی، پریاں، جن، دیو، جادوگر، طلسم اور ان کے سب کے رسم و رواج ایک ساتھ مخلوط نظر آتے ہیں۔راجہ اندر کا دربار بھی نظر آتا ہے۔راجہ اندر کے دربار میں بکاؤلی کو راجہ شراپ دیتا ہے کہ تو بارہ برس تک آدھی پتھر کی رہ کر دوبارہ ایک کسان کے گھر میں پیدا ہو کر اپنے محبوب سے ملتی ہے۔اس طرح اس مثنوی میں عقیدۂ تناسخ کا بیان بھی پلاٹ کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

﴿کردار نگاری﴾:۔گلزارِنسیم کے کردار خود نسیم کے ایجاد کردہ کردار نہیں ہیں اس لئے اس مثنوی کی کردار نگاری بہت زیادہ مضبوط نظر نہیں آتی باوجود اس کے اس کے کرداروں میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس قصہ کا ہیرو شہزادہ تاج الملوک اور ہیروئن بکاؤلی ہے۔تاج الملوک اور بکاؤلی دونوں کے کردار خاصے مضبوط نظر آتے ہیں۔یہ دونوں کردار زندہ دل اور جوش و خروش سے بھرپور نظر آتے ہیں۔شہزادہ تاج الملوک ذہین اور دور اندیش ہے اس کے اندر فرض شناس بیٹے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔وہ حساس طبیعت کا مالک ہے۔موقع شناسی سے کام لینا اس کو خوب آتا ہے۔وہ باہمت اور حوصلہ مند ہیرو کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔وہ تمام مصائب و آلام برداشت کرتا ہے۔مختلف پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرتا ہے مگر ہمت نہیں ہارتا اور آخر میں کامیاب ہوتا ہے۔بھائیوں کے دھوکہ دینے پر بھی وہ ان سے انتقام نہیں لیتا۔غرض کہ تاج الملوک میں بے پناہ خوبیاں ہیں اور وہ اس مثنوی کا نمایاں کردار ہے۔

بکاؤلی ایک پری ہے اور اس مثنوی کا دوسرا اہم کردار ہے۔وہ بے پناہ حسن کی مالکن ہے اس کی خوب صورتی کے چرچے چاروں سمتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔تاج الملوک جب اس کی خواب گاہ میں پہنچ کر اس کے حسن و جمال کو دیکھتا ہے تو دنگ رہ جاتا ہے۔بکاؤلی بھی

تاج الملوک کی طرح ذہین اور ہوشیار و بہادر ہے۔ پھول چوری ہو جانے پر وہ خاموش نہیں رہتی نہ ہی بے بسی اور لاچاری میں کفِ افسوس ملتی ہے بلکہ پھول کی تلاش میں مردانہ بھیس بنا کر بادشاہ تک پہنچتی ہے اور وہاں وزیر کا منصب حاصل کر لیتی ہے۔ ساتھ ہی وہ پری کی شکل اور بعد میں تناسخ کے عمل کے ذریعہ ایک کسان کے گھر میں پیدا ہو کر تاج الملوک کی شریکِ حیات بنتی ہے۔ اس میں وفاداری، فرض شناسی، عقل مندی اور شوہر پرستی کی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک مشرقی عورت کا شیوہ ہیں۔ وہ آخر وقت تک تاج الملوک کے ساتھ رہتی ہے اور ہر طرح سے اس کی غم گسار بنتی ہے۔ بکاؤلی میں ایک خوشگوار خود اعتمادی اور احساسِ قوت ہے۔ عشق کا جذبہ، شدتِ ایثار، مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اور اپنی ذمے داری اور حقوق العباد کا لحاظ وغیرہ اس کے کردار کی اہم خوبیاں ہیں۔

ان دو کرداروں کے علاوہ باقی ضمنی کردار ہیں اور صرف قصے کو آگے بڑھانے میں مدد کرتے ہیں دلبر بیسوا ہے جو چوسر کھلاتی ہے اور شکست دے کر دھوکہ سے دولت کماتی ہے۔ حمالہ دیونی ہے جو گل بکاؤلی حاصل کرنے میں تاج الملوک کی مدد کرتی ہے۔ محمودہ، حمالہ دیونی کے ساتھ رہنے والی ہے۔ راج کماری چتر اوت منگل دیپ کے راجہ کی بیٹی ہے جو تاج الملوک کے عشق میں غمگین رہتی ہے وزیر زادہ تاج الملوک کا دوست ہے مگر اس کے ذریعے کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں ہو پاتا۔

﴿منظر نگاری﴾:۔ دیا شنکر نسیم کو منظر نگاری پر عبور حاصل تھا مگر مثنوی کو مختصر کرنے کے چکر میں وہ بہترین منظر نگاری کرنے سے چوک گئے۔ یہ کمی مثنوی میں بعض جگہوں پر صاف نظر آتی ہے۔ اگر یہ مثنوی اپنی اصل حالت میں سامنے آتی تو اس میں عمدہ منظر نگاری کے نمونے سامنے آتے۔ اس لئے اس مثنوی کی سب سے بڑی کمی اس میں مناظرِ قدرت اور دیگر چیزوں کا بیان مفقود ہوتا ہے۔

گلزارِ نسیم کی منظر نگاری کے کچھ نمونے ملاحظہ کیجیے۔

جب تاج الملوک پریوں کے کپڑے چراتا ہے تب وہ شرماتی ہوئی کس طرح دکھتی ہے۔ دیکھیے:

جب خوب وہ شعلہ رو نہائیں — باہر بصد آب و تاب آئیں
پوشاک دھری ہوئی نہ پائی — جانا کہ حریف نے اُڑائی
جھک جھک کے بدن چراتی آئیں — رُک رُک کے قدم اُٹھاتی آئیں

ایک خوف ناک جنگل کا منظر جہاں تاج الملوک کا گزر ہوتا ہے۔

ایک جنگلے میں جا پڑا جہاں گرد — صحرائے عدم بھی تھا جہاں، گرد
سائے کو پتا نہ تھا شجر کا — عنقا تھا، نام جانور کا

راجہ جب لونڈیوں سے سوال کرتا ہے اور ان کو جب اس سوال کا مناسب جواب نہیں سوجھتا تب ان کی کیفیت کا منظر دیکھیے:

منہ پھیر کے ایک مسکرائی — آنکھ ایک ایک کو دکھائی
چتون کو ملا کے رہ گئی ایک — ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

﴿جذبات نگاری﴾:۔ مثنوی میں شدت جذبات کے وہ نمونے کم ہی نظر آتے ہیں جیسے سحر البیان میں ملتے ہیں۔ ان میں وہ گرمی نہیں ہے جو سحر البیان کا خاصہ ہے۔ نسیم کچھ ہی مقامات پر اچھی جذباتیت کو پیش کرنے میں کامیاب رہے۔ جب باغ سے پھول غائب ہو جاتا ہے تب بکاؤلی کی گھبراہٹ اور اس کی جذباتی کیفیت دیکھیے:

گھبرائی کہ ہیں، کدھر گیا گُل! جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون؟ ہے ہے مجھے خار دے گیا کون؟
ہاتھ اُس پر اگر پڑا نہیں ہے بو ہو کے تو پھول اُڑا نہیں ہے

فراق میں بکاؤلی کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے دیکھیے:

سنسان وہ دم بخود تھی رہتی کچھ کہتی، تو ضبط سے تھی کہتی
کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں آنسو پیتی تھی ، کھا کے قسمیں

تاج الملوک اور بکاؤلی کا راز فاش ہونے پر ان کی جذباتی کیفیت دیکھیے:

دونوں کے رہی نہ جان تن میں کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں

﴿مکالمہ نگاری﴾:۔ اس مثنوی میں جو مکالمے پیش کیے گئے ہیں وہ ڈرامہ نگاری کی شان پیدا کرتے ہیں جس سے مثنوی میں ڈرامائی عناصر کی کارفرمائی موجود ہے۔ جب روح افزا رہا ہو کر آتی ہے تو جمیلہ اور بکاؤلی اس سے ملتی ہیں اور اس کا حال پوچھتی ہیں تو مکالمہ کی یہ شان اُبھرتی ہے:

روح افزا سے ہوئیں بغل گیر صورت پوچھی، کہا کہ تقدیر

اس طرح تاج الملوک کا دلبر بیسوا سے رخصت ہونے کا مکالمہ:

یہ کہہ کے اُٹھا، کہا کہ لو جان! جاتے ہیں، کہا: خدا نگہبان!

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مثنوی گلزارِنسیم میں جہاں تہاں کئی مقامات پر مکالمے کا انداز پایا جاتا ہے۔ حالاں کہ رواں دواں کہانی میں مکالمے کو ٹانکنا مشکل کام ہے مگر نسیم نے اس معاملے میں اپنی فنی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے اور گلزارِنسیم کی خوبی میں ایک اضافہ کیا ہے۔ روح افزا اور اس کی بہن کے درمیان ہونے والے مکالمے کا ایک نمونہ دیکھیے:

روح افزا نے کہا بہن سے بہتر کوئی جا نہیں چمن سے
گل گشت کریں چلو، کہا: خیر کیا جانے کہ ہوگی سیر میں سیر
بولی وہ کہ آشنا تمہارا پیار اُنہیں، پیاری کا ہے پیارا

راجہ اندر اور اس کے ماتحتوں کے درمیان بکاؤلی کو لیے کر گفتگو:

ناتا پریوں سے اُس نے توڑا رشتہ ایک آدمی سے جوڑا
وہ سن کے خفا ہوا، کہا: جاؤ جس طرح سے بیٹھی ہو م، اُٹھا لاؤ

07.05 مثنوی ''گلزارِنسیم'' کی دیگر خصوصیات

﴿۱﴾ معاشرت کی تصویر کشی:۔ گلزارِنسیم میں نوابین اودھ کے عہد کی تہذیب وتمدن کے نظارے ملتے ہیں۔ اس وقت کے رسم و رواج، طرزِ زندگی، ماحول، کوچہ و بازار وغیرہ کی تصویر صاف صاف نظر آتی ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم نے نواب غازی الدین حیدر، نواب محمد علی

شاہ، نواب امجد علی شاہ کا زمانہ دیکھا تھا اس لئے اس عہد کے لکھنؤ کا جو مزاج تھا وہ نسیم نے نہایت فنی چابک دستی سے اس میں پیش کر دیا۔ بکاؤلی کی شادی کی کچھ رسمیں دیکھیے جو اس وقت کے لکھنؤ میں رائج تھیں۔ مثلاً:

گل سے خوانوں میں زردہ لایا اُن غنچہ دہانوں کو کھلایا
جب عقد کی، اُن کے ساعت آئی دو رشتوں میں اک گرہ لگائی
حق پاکے، جو رکھتی تھیں قدامت بول اُٹھیں مبارک و سلامت

﴿۲﴾ اسلوب نگاری:۔ نسیم کے وقت میں بقول ان کے استاد آتش شاعری بندشِ الفاظ، نگینے جڑنے اور مرصع سازی کا کام تھی۔ نسیم نے بھی اس نئے اسلوب کو اپنایا اور لفظی و معنوی صنعتوں اور رعایتِ لفظی کے التزام پر خاص طور سے توجہ دی۔ اس نئے اسلوب کو انہوں نے اپنی فن کارانہ مہارت اور خوش سلیقہ سے اس طرح استعمال کیا کہ ان کا فن معنی آفرینی کا ایک نیا انداز بن گیا۔ نسیم کے اسلوب کی سب سے بڑی خاص خوبی یہ ہے کہ انہوں نے رعایتِ لفظی کو جس مہارت اور سلیقہ سے شعر کے پیکر میں ڈھالا ہے اردو کی طویل مثنویوں میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ نسیم نے مثنوی کو مختصر کرتے ہوئے اس کے اندر مثنوی نگاری کے سبھی محاسن بھر دیے۔ اس طرح یہ مثنوی اپنے طرز کی منفرد مثنوی بن جاتی ہے اور ساتھ ہی دیا شنکر نسیم کا فن بھی منفرد اسلوب کا نمائندہ بن جاتا ہے۔ گلزارِ نسیم خالصتاً لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے جس میں رنگینی، ذوق و جمال اور مرصع کاری کی طرف غالب رجحان پایا جاتا ہے۔

﴿۳﴾ مافوق الفطرت عناصر:۔ اردو کی دیگر مثنویوں کی طرح اس مثنوی میں مافوق الفطرت عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہ عناصر محیّر العقول انداز میں پیش کیے گئے ہیں جس سے بیانات نہ صرف دل چسپ بن گئے ہیں بلکہ یہ مثنوی کے تکلف و تصنع میں اضافہ کرتے ہیں۔ سحر البیان کے مقابلے میں گلزارِ نسیم میں مافوق الفطرت عناصر کی کارفرمائی زیادہ ہے۔

﴿۳﴾:۔ پروفیسر رشید حسن خاں اپنی مرتب کردہ گلزارِ نسیم کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

ان کا (نسیم) خاص انداز پانچ اجزاء سے مرکب ہے۔

(۱) بیان کا ایسا اختصار کہ بظاہر اس سے زیادہ ممکن معلوم نہیں ہوتا۔

(۲) لفظی مناسبتوں اور رعایتوں کی مدد سے مفہوم میں پہلوداری پیدا کرنا۔

(۳) لفظی اور معنوی صنعتوں کے واسطے سے حسنِ بیان میں اضافہ کرنا۔

(۴) نئے پن سے مامور تشبیہیں۔

(۵) بیان کا استحکام یعنی بندش کی چستی۔

اختصار مکالمے کے انداز میں:۔

پوچھا کہ طلب ، کہا: قناعت پوچھا کہ سبب، کہا: کہ قسمت

☆

تنہا اُسے دیکھ کر کہا : ہیں محمودہ کیا ہوئیں؟ کہا : ہیں

رعایتِ لفظی:۔ گُل بکاؤلی کی تلاش میں بادشاہ شہزادوں کو سفر کی اجازت دیتا ہے۔نسیم نے اس کو اس طرح پیش کیا ہے:

شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار رخصت کیے شہ نے چار نا چار

صنعت تجنیس مضارع:۔

شہزادہ ہنسا، کہا کہ دلبر! کچھ بات نہیں، جو رکھیے دل پر

صنعت تجنیس لاحق:۔

غولوں سے بھرا جو تھا بیاباں پھولوں سے بنا دیا خیاباں

صنعتِ ایہام:۔

دیو اُس کے عمل میں آ گئے ہیں جادو کے محل بنا گئے ہیں

صنعتِ تضاد:۔

بولا، جب اُس نے باندھے بازو کھلتا نہیں کس طمع پہ ہے تو

چستیِ بندش:۔

انسان و پری کا سامنا کیا! مٹھی میں ہوا کا تھامنا کیا!

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار اب مان نہ مان ، تُو ہے مختار

تشبیہیں:۔

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

جاگی مرغِ سحر کے غُل سے اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے

استعاراتی واشارتی پیرایۂ بیان:۔

ترکش پہ نگاہ کی، تو تھا تیر قبضے میں پھر آئی کھوئی شمشیر

بولا وہ فسردہ دل سحر گاہ کیا سرد ہوا ہے، واہ وا واہ

بولی وہ کہ ہونے کو ہوا ہے جو غنچے کو گُل کرے، صبا ہے

گُلزارِنسیم کی خوبیوں میں ایک اور بڑی اہم خوبی اس کا ایجاز واختصار ہے۔شروع میں یہ مثنوی کافی طویل تھی نسیم نے جب یہ مثنوی اپنے استاد آتش کو دکھائی تو انہوں نے کہا کہ اس کو یا تو تم پڑھ سکتے ہو یا میں اور پھر انہوں نے نسیم سے اس کو مختصر کرنے کو کہا نسیم نے استاد کے مشورہ کو قبول کیا اور آتش کی ہدایت پر مثنوی کو مختصر کر کے نئے سرے سے لکھا اور یہی اختصار اس مثنوی کا معجزہ کہلایا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری گلزارِنسیم کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس میں کردار نگاری، جذبات نگاری اور تسلسل بیان کی کم وبیش وہ سبھی خصوصیات ہیں جو کہ ایک

افسانوی مثنوی کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہیں لیکن اس کی دل کشی کا راز دراصل اس کی رنگین بیانی، معنی آفرینی، کنایاتی اسلوب، لفظی صناعی اور ایجاز نویسی میں پوشیدہ ہے۔ ان اوصاف میں بھی اختصار و ایجاز کا وصف امتیازی شان کی حیثیت رکھتا ہے۔''

07.06 مثنوی ''گلزارِ نسیم'' انتخاب: متن

(آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گُل چین کی تلاش میں)

انتخاب ''گلزارِ نسیم''

گُل کا جو اَلَم چمن چمن ہے — یوں بُلبُلِ خامہ نعرہ زَن ہے
گُل چیں نے وہ پھول جب اُڑایا — اور غنچۂ صبح کھلکھلایا
وہ سبزۂ باغِ خوابِ آرام — یعنی وہ بکاؤلی گُل اندام
جاگی مرغِ سحر کے غُل سے — اُٹھی نکہت سی فرشِ گُل سے
مُنہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی — پُر آب وہ چشمِ حوض پائی
دیکھا، تو وہ گُل ہَوَا ہوا ہے — کچھ اور ہی گُل کِھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گُل؟ — جھنجھلائی کہ کون دے گیا جُل؟
ہے ہے مِرا پھول لے گیا کون — ہے ہے مجھے خار دے گیا کون؟
ہاتھ اُس پر اگر پڑا نہیں ہے — بُو ہوکے تو پھول اُڑا نہیں ہے؟
نرگس! تُو دِکھا کدھر گیا گُل؟ — سوسن! تُو بتا کدھر گیا گُل؟
سنبل! مِرا تازیانہ لانا — شمشاد! اِنہیں سولی پر چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورتِ بید — ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں — سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا — کہنے لگیں : کیا ہوا خدایا!
اپنوں میں سے پھول لے گیا کون؟ — بے گانہ تھا سبزے کے سوا کون؟
شبنم کے سوا چُرانے والا — اوپر کا تھا کون آنے والا؟
جس کف میں وہ گُل ہو، داغ ہو جائے — جس گھر میں ہو، گُل چراغ ہو جائے
بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس! — غفلت سے یہ پھول پر پڑی اُوس

آنکھوں سے عزیز گُل مِرا تھا پُتلی وہی چشمِ حوض کا تھا
نام اُس کا صبا! نہ لیتی تھی مَیں اُس گُل کو ہوا نہ دیتی تھی مَیں
گُل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا غُنچے کے بھی مُنہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار! پڑا نہ تیرا چنگُل مشکیں کس لیں نہ تُو نے سُنبُل!
او بادِ صبا! ہوا نہ بتلا خوشبو ہی سُنگھا ، پتا نہ بتلا
بُلبُل! تُو چہک، اگر خبر ہے گُل! تو ہی مہک، بتا کدھر ہے؟
لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام تھی سبزے سے راست مُو برانْدام
اُنگلی لبِ جُو پہ رکھ کے شمشاد تھا دَم بخود، اُس کی سُن کے فریاد
جو نخل تھا، سوچ میں کھڑا تھا جو برگ تھا، ہاتھ مَل رہا تھا
رنگ اُس کا غرض لگا بدلنے گُل برگ سے کف لگی وہ مَلنے
بدلے کی انگوٹھی ڈھیلی پائی دست آویز اُس کے ہاتھ آئی
خاتم، تھی نام کی نشانی انسان کی دست بُرد جانی
ہاتھوں کو مَلا، کہا کہ ہیہات! خاتم بھی بدل گیا ہے بد ذات
جس نے مجھے ہاتھ ہے لگایا وہ ہاتھ لگے کہیں خدایا!
عریاں مجھے دیکھ کر گیا ہے کھال اُس کی جو کھینچیے، سزا ہے
یہ کہہ کے، جنوں میں ہوغضب ناک خوں روئی، لباس کو کیا چاک
گل کا سا لہو بھرا گریباں سبزے کا سا تار تار داماں
دِکھلا کے کہا سمن پری کو اب چین کہاں بکاؤلی کو؟
تھی بس کہ غبار سے بھری وہ آندھی سی اُٹھی، ہوا ہوئی وہ
کہتی تھی پری کہ اُڑ کے جاتی گُل چیں کا کہیں پتا لگاتی
ہر باغ میں پھولتی پھری وہ ہر شاخ پہ جھولتی پھری وہ
جس تختے میں مثلِ باد جاتی ق اُس رنگ کے گُل کی بُو نہ پاتی
بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے؟ پتّا کہیں حُکم بِن ہلا ہے؟

ختم شد

07.07 مثنوی ''گلزارِنسیم'' انتخاب: تشریح

گُل کا جوا لَم چمن چمن ہے.....کہنے لگیں: کیا ہوا؟ خدایا!

مذکورہ بالا اشعار دیا شنکر نسیم کی مثنوی ''گلزارِنسیم'' بعنوان (آوارہ ہونا بکاؤلی کا تاج الملوک گُل چین کی تلاش میں) سے متعلق ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار میں سے چند اشعار کی تشریح کی جارہی ہے ان اشعار میں تاج الملوک کے ذریعے گُل بکاؤلی کو چُرا لیا جاتا ہے۔ گُل کے فراق اور چوری ہونے کی بعد کی کیفیت کا ذکر ان اشعار میں کا کیا گیا ہے۔ پھول جب چوری ہوجاتا ہے تو اس غم سے سارے چمن والے غمزدہ و پریشان ہوجاتے ہیں اس کو نسیم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جب تاج الملوک نے پھول کو باغ سے چُرا لیا اور جب صبح ہوئی تب بکاؤلی جو کہ سُو رہی تھی بیدار ہوئی اور مثل خوشبو کے اُٹھی ہاتھ منھ دھوکر آنکھ ملتی ہوئی جب وہ حوض کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ حوض کی آنکھ نم ہے یعنی اُداسی اور غمگین ماحول ہے اور جب اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ پھول غائب ہے اور کچھ دوسرا ہی رنگ کھلا ہوا ہے گُل بکاؤلی کے غائب ہوجانے پر بکاؤلی حیران و پریشان ادھر ادھر بھاگتی پھرتی ہے۔ اچنبھے کی حالت میں خود کلامی کرنے لگی کہ اُس کو کون دغا دے گیا، کس نے ایسی حرکت کی آخر پھول کو کون لے گیا، کون مجھے دھوکہ دے گیا، اگر اس کو کسی نے چھوا نہیں کوئی اس کو لے کر گیا نہیں، تو ایسا ممکن ہی نہیں کہ وہ خوشبو بن کے اُڑ جائے۔ بکاؤلی اب سارے چمن میں بدحواسی کے عالم میں ہر ایک سے پوچھ رہی ہے کہ نرگس اور سوسن اب تم ہی بتاؤ کہ گُل کہاں گیا سُنبل اور شمشاد پتا لگاؤ اور جس نے ایسی حرکت کی ہے اس کو پھانسی کی سزا دے دو۔ یہ سارا منظر دیکھ کر خواصیں اور خدمت گار مثلِ بید تھر تھرانے لگیں کہ اب کیا ہوگا؟ ایک دوسرے سے اس کا راز پوچھنے لگیں۔ چمن کے دوسرے پھول نرگس اور سوسن نے ہر طرح کی کوشش کی کہ گُل بکاؤلی کے غائب ہونے کی وجہ پتہ چل سکے یہ معلوم ہو کہ آخر پھول کہاں گیا مگر وہ ناکام رہے۔ چمن کا پتّا پتّا اور بوٹا بوٹا جب اس راز کو نہ پا سکا تو تھک ہار کر کہنے لگے کہ

خدایا آخر کہاں گیا گُل ☆ اور کون دے گیا جُل۔

نوٹ:۔ طلبا اسی طرح دیگر حصوں کی تشریح کر سکتے ہیں۔

07.08 خلاصہ

نسیم کا پورا نام پنڈت دیا شنکر کول تھا۔ ۱۸۱۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد کشمیری تھے مگر ترکِ وطن کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ نسیم کی تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہی ہوئی۔ اردو اور فارسی پر اچھی دَست رَس حاصل کر لی۔ ذہن ابتدا ہی سے شاعری کی طرف مائل تھا۔ لہٰذا شعر گوئی کی شروعات غزل گوئی سے کی۔ آتش کی شاگردی اختیار کی۔ بیس سال کی عمر میں شاعری کے فن میں مہارت حاصل کر لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں شامل ہونے لگے، نسیم میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے چرچے سن رہے تھے لہٰذا مثنوی نگاری کی طرف رجحان بڑھا۔ اس وقت اردو اور فارسی میں بے شمار داستانیں موجود تھیں نسیم نے اپنی مثنوی کے لئے گُل بکاؤلی کا انتخاب کیا۔ یہ مثنوی شروع میں کافی بڑی تھی۔ آتش نے اس کو مختصر کرنے کا مشورہ دیا نسیم نے اس کو اتنا مختصر کیا کہ ایجاز و اختصار کی نمایاں خوبی بن گئی۔ نسیم نے گلزارِنسیم کو ۲۸ رسال کی عمر میں ۱۸۴۴ء میں تخلیق کی اور ۱۸۴۵ء میں نسیم کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ گلزارِنسیم ہند ایرانی مشترکہ تہذیب کی عمدہ مثال ہے۔ یہ خالصتاً لکھنوی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے جس میں لکھنوی دبستانِ شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ پلاٹ، کردار نگاری، جذبات نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری اور دیگر خصوصیات کی بنا پر یہ مثنوی آج بھی اپنے انداز کی سرِ فہرست مثنوی ہے۔

07.09 فرہنگ

اخگر	: چنگاری	دیدہ کور	: جس کو دکھائی نہ دے
اُشتر	: اُونٹ	ریگ ماہی	: ریت کی مچھلی
اندام	: جسم، بدن	شگوفہ	: بِن کھِلا پھول، انوکھی بات
انگشتری	: انگوٹھی	صحرائے عدم	: بہت بڑا جنگل
ایاغ	: پیالہ، ساغر	کحّال	: آنکھوں کا حکیم، معالج
بردوش	: کندھے پر	کَف	: ہاتھ، ہتھیلی
پس ماندہ	: پچھڑا ہوا، وارث	گُلبن	: گُلاب کا پودا
چشمک	: رنجش، آنکھ کا اشارہ	گُل چیں	: پھول توڑنے والا
خامہ	: قلم	گُلفام	: پھول جیسے رنگ والا معشوق
خردمند	: ہوشیار، چالاک	گُل گشت	: باغ کی سیر
خصوصیات	: خصوصیت کی جمع، خوبیاں	مجہول	: سُست، کاہل، نامعلوم
خودکلامی	: اپنے آپ سے بات چیت	مساعی	: کوششیں
خَیل	: گروہ، جماعت، گھوڑوں کا گلّہ	نخل	: پیڑ
دشت	: جنگل	نمائندہ	: ظاہر کرنے والا
دل خواہ	: مرضی کے موافق، پسندیدہ	ہیہات	: افسوس کا کلمہ، ہائے ہائے

07.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ دیا شنکر نسیم کی سوانح حیات تحریر کیجیے؟

سوال نمبر۲ مثنوی ''گلزارِ نسیم'' کا تنقیدی جائزہ پیش کیجیے؟

سوال نمبر۳ نسیم کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک مضمون قلم بند کیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ گلزارِ نسیم کی اسلوب نگاری پر رائے دیجیے؟

سوال نمبر۲ گلزارِ نسیم کی بڑی خوبی اس کا ایجاز و اختصار ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟

سوال نمبر۳ کردار نگاری اور منظر نگاری کے اعتبار سے، گلزارِ نسیم کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ واضح کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : پنڈت دیا شنکر نسیم کا تعلق کس دبستان سے ہے؟

(الف) دبستانِ لکھنؤ (ب) دبستانِ دہلی (ج) دبستانِ عظیم آباد (د) دکن

سوال نمبر۲ : پنڈت دیا شنکر نسیم کس کے شاگرد تھے؟

(الف) ناسخ (ب) آتش (ج) انشا (د) مصحفی

سوال نمبر۳ : پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی کا نام کیا ہے؟

(الف) خواب وخیال (ب) سحرالبیان (ج) گلزارِ نسیم (د) زہرِ عشق

سوال نمبر۴ : ''سحرالبیان'' کس دبستان کی نمائندہ مثنوی ہے؟

(الف) دبستانِ دہلی (ب) دبستانِ عظیم آباد (ج) دکن (د) دبستانِ لکھنؤ

سوال نمبر۵ : پنڈت دیا شنکر نسیم کی وفات کہاں ہوئی؟

(الف) بنارس (ب) کان پور (ج) لکھنؤ (د) فیض آباد

سوال نمبر۶ : ''جذبات'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) جذباتی (ب) جذبہ (ج) جذب (د) مجذوب

سوال نمبر۷ : ''گلزارِ نسیم'' کے ہیرو کا نام کیا ہے؟

(الف) تاج الملوک (ب) زین الملوک (ج) محسن الملک (د) عماد الملک

سوال نمبر۸ : ''گلزارِ نسیم'' کی ہیروئن کا نام کیا ہے؟

(الف) رُوح افزا (ب) بکاؤلی (ج) حُسن آرا (د) ماہ رُخ

سوال نمبر۹ : ''فراق'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) فریق (ب) ملاقات (ج) جدائی (د) ملن

سوال نمبر۱۰ : ''زین الملوک'' کس کا باپ ہے؟

(الف) رُوح افزا کا (ب) حُسن آرا کا (ج) بکاؤلی کا (د) تاج الملوک کا

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) دبستانِ لکھنؤ

جواب نمبر۲ : (ب) آتش

جواب نمبر۳ : (ج) گلزارِ نسیم

جواب نمبر۴ : (د) دبستانِ لکھنؤ

جواب نمبر۵ : (ج) لکھنؤ

جواب نمبر۶ : (ب) جذبہ

جواب نمبر۷ : (الف) تاج الملوک

جواب نمبر۸ : (ب) بکاؤلی

جواب نمبر۹ : (ج) جدائی

جواب نمبر۱۰ : (د) تاج الملوک کا

07.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو مثنوی کا اِرتقا شمالی ہند میں از پروفیسر گیان چند جین

۲۔ اردو مثنوی کا اِرتقا از عبدالقادر سروری

۳۔ مثنوی گلزارِ نسیم از مرتبہ پروفیسر رشید احمد خاں

اکائی 08 مرزا شوق لکھنوی: مثنوی زہرِ عشق

ساخت

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : مرزا شوق لکھنوی کے حالاتِ زندگی

08.04 : مرزا شوق لکھنوی کی شاعری

08.05 : مرزا شوق لکھنوی کی مثنویاں

08.06 : مثنوی ''زہرِ عشق'' کا ماخذ

08.07 : مثنوی ''زہرِ عشق'' انتخاب: متن

08.08 : مثنوی ''زہرِ عشق'' انتخاب: تشریح

08.09 : خلاصہ

08.10 : فرہنگ

08.11 : نمونہ امتحانی سوالات

08.12 : حوالہ جاتی کتب

08.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں مرزا شوق لکھنوی کی زندگی اوران کی ادبی کارناموں کے تعلق سے گفتگو کی جائے گی۔ان کی شاملِ نصاب مشہور مثنوی ''زہرِ عشق'' کا بھرپور جائزہ لیا جائے گا۔اصنافِ شاعری میں مثنوی اس مسلسل نظم کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی قصہ یا کہانی بیان کی گئی ہو،اس کے خدوخال میں اشخاص، کردار، رہن سہن، بول چال، رنج وخوشی، رزم وبزم، عشق ومحبت غرض ہر حرکت جامع اور مکمل حیثیت رکھتی ہے۔مثنوی اپنے تسلسلِ بیان اور واقعات نگاری کی وجہ سے ایک منفرد امتیاز رکھتی ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالؔی نے اپنے مقدمہ میں اس صنف کو زیادہ کارآمد صنف سخن قرار دیا ہے۔مثنوی میں ظاہری ومعنوی ہر اعتبار سے شاعری کے تمام لوازمات ملتے ہیں۔اس کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مثنوی میں غزل کا سوز وگداز، حسن وعشق کی رعنائیاں، قصیدہ کی تشبیب کی شان، رزم وبزم کی ہنگامہ آرائیاں سبھی کچھ مضمر ہوتی ہیں۔فارسی میں مثنوی کہنے کا رواج عام تھا۔فارسی کے بعد خصوصاً اردو کے ابتدائی دور میں یعنی دکنی شاعری میں بہت ہی زیادہ مثنویاں لکھی گئیں۔

بہمنی دور کی دَست یاب مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' سے لے کر دکنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے تک اور اس کے بعد ولؔی اور سراؔج اورنگ آبادی تک مثنویوں کی ایک عظیم تاریخ ہے۔شمالی ہند کی اولین مثنوی افضؔل کی ''بکٹ کہانی'' ہے۔اس کے علاوہ میر حسؔن، دیا شنکر نسیؔم اور مرزا شوؔق کی مثنویاں بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں۔

08.02 تمہید

اُردو میں مثنوی کی تاریخ بھی بہت طویل ہے۔لیکن اس تاریخ میں چند مثنویاں ایسی بھی ہیں جن کی چمک دمک پر ماہ وسال کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے، دکنی اردو کی مثنویوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے۔کہ اس زمانے میں بھی میؔر کی مثنویاں، میر حسؔن کی ''سحرالبیان''، دیا شنکر نسیؔم کی ''گلزارِ نسیم'' اور نواب مرزا شوؔق کی مثنوی ''زہرِ عشق'' کو آج بھی حیرت انگیز طور پر مقبولیت کا شرف حاصل ہے۔مرزا شوؔق آتؔش لکھنوی کے شاگرد تھے۔ان کی پیدائش اس زمانے میں ہوئی جس وقت کے اودھ کی تہذیب اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔آپ نے طویل عمر پائی۔آپ رنگین مزاج کے حامل تھے۔آٹھ والیانِ اودھ کا زمانہ دیکھا۔والد محترم نے ایک عرصے تک درباری زندگی سے دور رکھا۔آخر میں واجد علی شاہ کے دربار سے منسلک ہوئے تو ان کے شاعرانہ مزاج میں نکھار آ گیا۔لکھنوی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ آپ کے مزاج میں شوخی ورنگینی اور زبان پر قدرت حاصل تھی۔آپ ایک قادرالکلام شاعر تھے۔

08.03 مرزا شوؔق لکھنوی کے حالاتِ زندگی

آپ کا اسم گرامی حکیم تصدق حسین خاں اور آپ کی عرفیت نواب مرزا جب کہ تخلص شوؔق تھا۔حکیم نواب مرزا کے نام سے آپ کی شہرت تھی۔مرزا شوؔق کے والد محترم کا نام آغا علی خان تھا۔مرزا شوؔق کا پورا خاندان حکمت وطبابت میں بہت مشہور تھا لیکن ان کے چچا جان مرزا علی خان لکھنؤ کے مشہور حکیموں میں سے ایک تھے۔وہ شاہانِ اودھ کے دربار میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔بادشاہ کی جانب سے آپ کو حکیم الملک کا خطاب بھی ملا تھا۔شوق کی پیدائش ۱۷۸۳ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔یہ دور آصف الدولہ کا تھا۔آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مکمل کی۔اس کے بعد اپنے عہد کے مشہور اساتذہ سے علم حاصل کر کے مختلف علوم وفنون میں مہارت تامہ حاصل کی۔

خاندانی پیشہ طب اور حکمت پر بھی مرزا شوؔق کو کامل عبور تھا۔آپ شاہی طبیب تھے۔جب شوؔق نے اپنا ہوش سنبھالا تو ہر طرف شعرو سخن کا بول بالا تھا۔شوؔق نے بھی اسی شعری ماحول سے متاثر ہو کر شعر گوئی کی طرف توجہ فرمائی۔اپنے دور کے نام وَر اساتذہ میں خواجہ آتؔش کا رنگ وآہنگ پسند آیا پھر آپ انہیں کے شاگرد ہو گئے۔ابتدا میں تقریباً ہر شاعر نے غزل ہی کی طرف توجہ دی۔ ہر شاعر کی اقتدا کرتے ہوئے آپ نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے ہی کیا پھر مثنوی کی طرف متوجہ ہو گئے۔مرزا شوؔق بہت ہی خوب صورت تھے۔کہتے ہیں کہ ایام جوانی میں شہر کے خوبرو لوگوں میں آپ کا بھی شمار ہوتا تھا۔آپ کی عمر ۸۸ سال ہوئی۔

آرام کی زندگی گزاری۔عیش پرست اور رنگین مزاج تھے اس لئے ان کے بزرگوں نے ان کو ایک مدت تک دربار سے الگ تھلگ ہی رکھا۔بالآخر واجد علی شاہ کے زمانے میں دربار سے وابستہ ہوئے۔واجد علی شاہ کے دور میں جہاں ایک طرف عیش وعشرت کا چرچہ تھا تو وہیں دوسری جانب شعروشاعری اور علم وادب کی بھی ترقی ہو رہی تھی۔کیوں کہ واجد علی شاہ خود شاعر تھے۔واجد علی شاہ مرزا شوؔق کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے۔آپ کی تنخواہ پانچ سو روپیہ مقرر کی گئی تھی۔اس کے علاوہ انعام واکرام کے بھی آپ مستحق ہوتے تھے۔مرزا شوؔق ایک ذی علم اور طبیب حاذق تھے فنون لطیفہ کا بڑا شوق تھا۔مرزا شوق نے آصف الدولہ سے واجد علی شاہ تک کا زمانہ دیکھا۔

لکھنؤ کی زندگی کے لطف اٹھائے۔ بالآخر مرزا شوقؔ لکھنوی ۳۰ر جون ۱۸۷۱ء کو اپنی عمر فانی کی اٹھاسی بہاریں دیکھنے کے بعد اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی تدفین لکھنؤ کے ریلوے لائن کے نیچے قبرستان میں ہوئی۔ جہاں میر تقی میرؔ، انشا اللہ خاں انشاؔ، غلام ہمدانی مصحفیؔ وغیرہ کے مدفن بھی ہیں۔

08.04 مرزا شوقؔ لکھنوی کی شاعری

مرزا شوقؔ نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں۔ وہ لکھنوی شاعری کا دورِ عروج تھا۔ گھر گھر مشاعروں کے چلن عام تھا۔ شعرا کو دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایک خاص رنگ شاعری کا اثر چاروں طرف تھا۔ اگر شوق اس کوچہ میں قدم نہ رکھتے تو اس زمانے کا ماحول انہیں بدذوق قرار دیتا اور معاشرہ ان کو نااہل سمجھتا اور اپنے ہم مشربوں میں شوق کا سر جھکا رہتا۔ اس لئے شوق نے بھی مشق سخن شروع کی۔ آتشؔ و ناسخؔ جیسے عظیم اساتذۂ فن کا دور تھا۔ انہیں دونوں شاعروں کے شاگردوں کا طوطی بول رہا تھا۔ رند، صبا، وزیر، اسیر، رشک وغیرہ کی شہرت عام تھی۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ بھی غزل گو شاعر تھے لیکن شوق کو غزل سے زیادہ رغبت نہ تھی۔

مرزا شوقؔ نے بھی خواجہ حیدر علی آتشؔ کی شاگردی اختیار کی اور شوقؔ نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ ان کی جو غزلیں موجود بھی ہیں عموماً روکھی وپھیکی ہیں۔ مگر شوق غزل کے میدان میں کوئی کمال حاصل نہ کر سکے۔ استاد کا رنگ شاعری الگ اور شوق کی افتادِ طبع کا تقاضا کچھ اور تھا۔ بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد آتشؔ نے بے نیازی اختیار کر لی۔ مرزا شوق نے پھر بھی اپنی مشق جاری رکھی۔ اس زمانہ میں مثنوی کا بہت چرچا تھا۔ میر حسنؔ کی ''سحر البیان'' لکھنوی شعرا کے لئے ایک تازیانہ بن گئی اور اس نے ایک شاہ کار کی حیثیت اختیار کر لی۔ پھر تو ہر طرف مثنوی کہنے کا شوق عام ہو گیا۔ مگر میر حسنؔ کے بعد اس میں آتشؔ کے شاگرد دیا شنکر نسیمؔ نے ''گلزارِ نسیم'' لکھ کر جو شہرت دوام حاصل کی وہ اس زمانے میں کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی حالاں کہ اس کے بعد قلقؔ نے ''طلسمِ الفت''، جیسی اچھی مثنوی پیش کی۔ بالآخر شوقؔ نے بھی اس صنف میں طبع آزمائی شروع کی اور ان کے جوش نے ''فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق'' جیسے فن پارے تخلیق کیے۔ جن کے سامنے میر حسن اور نسیم کے بھی شاہ کار ماند پڑنے لگے۔

منشی امیر احمد علوی نے لکھا ہے:

> ''طلسمِ الفت ابھی تمام نہ ہوئی تھی کہ لکھنؤ نواب مرزا شوقؔ کے زمزموں سے گونجنے لگا اور حسن وعشق، عیش وعشرت کے متوالے نغمۂ ہائے شوق سے پرجوش ہو گئے۔ ''فریبِ عشق'' نے رنگین مزاج نوجوانوں کی آتشِ شوق پر تیل چھڑکا۔ ''بہارِ عشق'' نے دردمندانِ محبت کے دل چھینے اور ''زہرِ عشق'' کی حسرت ناک موسیقی نے سارے شہر کو دیوانہ بنایا۔ بندش کی صفائی، زبان کی سادگی، بول چال کی بے ساختگی، محاورات کی برجستگی نے عوام کے قلوب کو مسخر کیا۔ واقعہ نگاری اور نقش طرازی کے کمال نے خواص کی گردنیں خم کیں اور ان کی مثنویوں کو ایسی مقبولیتِ عام نصیب ہوئی کہ اگلے سخنوروں کے چراغ ٹمٹمانے لگے اور میر حسن کی ''سحر البیان'' فراموش ہو گئی۔''
>
> (مثنویات اردو)

ان کا سرمایۂ حیات ان کی تین مثنویاں ہی ہیں۔مثنویوں کے علاوہ شوقؔ نے دیگر کن اصناف میں طبع آزمائی کی اس کے تعلق سے کوئی علم نہ ہوسکا جب کہ تذکرۂ شوق سے چند غزلیں، متفرق اشعار اور ایک واسوخت کا علم ضرور ہوا ہے۔

شوق نے کم ہی غزلیں کہی ہیں اور نہ ان کا مطبوعہ وغیر مطبوعہ دیوان ملتا ہے۔شوقؔ کے ایک محقق عطاء اللہ پالوی نے مختلف تذکروں چھان بین کر کے غزلوں کے کچھ اشعار اپنی کتاب ''تذکرۂ شوق'' میں شامل کیے ہیں۔دبستانِ آتش کے مصنف شاہ عبدالسلام نے ان کی مثنویوں سے بھی غزل کے اشعار لے کر ان کی تعداد میں اضافہ کیا ہے۔اس میں مرزا شوقؔ کا سرمایۂ غزل صرف ۶۱/اشعار پر مشتمل ہے۔ان اشعار کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ شوق کی غزلوں کے مضامین میں نہ کوئی ندرت اور نہ تخیّل کی بلندی ہے۔نہ ہی عشق ومحبت کا سوز وگداز اور شیفتگی ووارفتگی ہے۔صرف ان کے اشعار میں زبان وبیان کی خوب صورتی ہے، محاوروں کا استعمال ہے، انداز بیان میں شوخی وسلاست ہے۔ غزلوں کے اکثر شعر مثنوی کے معلوم ہوتے ہیں جو غزل کے فارم میں لکھے گئے ہیں۔

جلوے نہیں دیکھے جو تمہارے کئی دن سے اندھیرے ہیں نزدیک ہمارے کئی دن سے
ہم جان گئے آنکھ ملاؤ نہ ملاؤ بگڑے ہوئے تیور ہیں تمہارے کئی دن سے

شوقؔ کے غزلیہ اشعار اپنے عہد کی مزاج سخن کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔وہی معاملہ بندی، عشوہ وناز، محبوب سے چھیڑ چھاڑ، شرارت وشوخی شوقؔ کے دریافت شدہ شعروں کے موضوعات ہیں۔اگر کوئی خوبی ہے تو وہ سلاستِ بیان ہے۔شوق نے ایک صرف واسوخت بھی کہی ہے۔یہ واسوخت ''مجموعۂ واسوخت'' مرتبہ فدا علی عیش میں شامل ہے۔اس کے ۴۱/بند ہیں مسدس کی فارم میں ہے۔اس کا موضوع واسوخت والا ہے۔یہاں شوقؔ نے شروع میں اپنے محبوب کی تعریف کی ہے۔کہ تو شروع میں بڑا بھولا تھا۔بھلے ہی شوخ تھا، مزاج میں گرمی تھی مگر جفا کار، خونخوار، دل آزار اور طرحدار نہیں تھا۔بات بات پر شرم آتی تھی۔آرائش وزیبائش کا بھی خیال نہیں تھا اور اب یہ حال ہے:

اب تو ہے اور ہی کچھ چہرۂ زیبا کی بہار دن میں آرائشِ تن ہونے لگی سَو سَو بار
جنبشِ ابرو پہ چل جاتی ہے ہر دَم تلوار گرتے ہیں پھول سے رخسار پہ عشاق ہزار

ڈاک کی طرح سے رخسار جو ضَو دیتے ہیں
عکس پڑ پڑ کے گہر کان کے، لَو دیتے ہیں

شوق کی غزلیہ کلام میں خیال کی وہ جولانی نہیں جو کہ اس واسوخت میں موجود ہے۔یہاں شوق کا رنگ کچھ زیادہ ہی صاف وشفاف ہے۔بندش کی چستی اور طبیعت کی روانی نمایاں ہے۔زبان میں وہی سلاست ہے جو ان کی غزلوں میں ہے۔

08.05 مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنویاں

مرزا شوقؔ کی مثنویوں کے تعداد کے بارے میں ہمیں مختلف آرا ملتی ہیں۔کاشف الحقائق میں امداد امام اثر نے، مقدمۂ شعر وشاعری میں خواجہ الطاف حسین حالؔی نے، خم خانۂ جاوید میں لالہ سری رام نے شوق کی مثنویوں کی تعداد چار بتائی ہے۔اول:۔زہرِ عشق، دوم:۔فریبِ عشق، سوم:۔بہارِ عشق اور چہارم:۔لذتِ عشق۔یہی چار مثنویاں دبستانِ لکھنؤ میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے بھی انہیں سے منسوب کی ہیں۔ جب کہ تذکرۂ شوق میں عطاء اللہ پالوی نے مرزا شوق کی تین مثنویوں کا ذکر کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ مرزا شوق سے منسوب چوتھی مثنوی ''لذتِ عشق'' مرزا شوق کے بھانجے آغا حسن نظم کی مثنوی ہے۔زمانۂ حال کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ مرزا شوق نے صرف تین مثنویاں ''فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق'' تخلیق کی ہیں۔

﴿۱﴾ فریبِ عشق:۔مرزا شوق کی یہ پہلی مثنوی ہے جو کہ گلزارِنسیم کی تکمیل کے آٹھ سال بعد ۱۸۴۶ء میں مکمل ہوئی۔اس مثنوی میں ۴۲۸/اشعار ہیں۔یہ مثنوی واقعاتی اورادبی لحاظ سے ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔شوق نے اس مثنوی میں اپنے عہد کی بعض شاہی بیگمات کے مشاغل اوران مشاغل کے پس پردہ کھیلے جانے والے اخلاق سوز واقعات کونظم کیا ہے۔

عطاءاللہ پالوی تذکرۂ شوقؔ میں لکھتے ہیں:

''اس مثنوی کے ذریعے علی الاعلان اہل لکھنوکواس سے آگاہ کیا کہ اس وقت کربلا، درگاہ اوروہ سارے مقاماتِ مقدّسہ جہاں جہاں مذہبی آڑ لے کراجتماعِ مردوزن ہوا کرتا ہے شبستانِ عیش وآوارگی کا اَڈّا بنے ہوئے ہیں اور ہماری عورتیں وہاں ہرگز تزکیۂ نفس کے لئے نہیں بلکہ تسکینِ نفس کے لئے جایا کرتی ہیں۔''

اس مثنوی میں لکھنوکی روزمرّہ زندگی کا ایک تاریک پہلو بڑے رنگین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس مثنوی میں شوقؔ نے عورت اور مرد کی فطرت اورنفسیات کو بڑی چابک دستی اورحقائق پرمبنی پیش کیا ہے۔بڑا ہی نازک موضوع ہونے کے باوجود رکاکت اورابتذال کہیں نہیں دکھائی دیتا۔اندازِبیان سادہ ہے لیکن لکھنؤ کی بیگماتی زبان اورمحاوروں کونہایت ہی صحت اورصفائی سے استعمال کیا ہے۔

﴿۲﴾ بہارِعشق:۔مرزا شوقؔ کی دوسری مثنوی بہارِعشق ۱۸۴۷ء میں منظرعام پرآئی۔اس میں ۸۴۲/اشعار ہیں۔اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔یہ مثنوی واجدعلی شاہ کے دور کے تہذیب ومعاشرت بہترین تصویرکشی کرتی ہے۔

اس کے متعلق ''ذوق وجستجو'' میں پروفیسرخواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''بہارِعشق'' پلاٹ یا کردارنگاری کے اعتبار سے کوئی بلند پایہ مثنوی نہیں ہے۔اس کی عظمت کا راز صرف اس کی زبان محاورے اور روزمرّہ کی چاشنی میں ہے۔شوقؔ نے اس مثنوی میں سادگی اورسلاست پر بہت زور دیا۔فریبِ عشق میں جوعریانیت نہیں ہے وہ یہاں بے محابہ اورغیرمہذّب ہے۔''

جب کہ عطاءاللہ کا خیال ہے کہ اردوزبان میں اس رنگ کی یہ واحد مثنوی ہے جونہ صرف زبان وبیان کے لحاظ سے بلکہ کئی اورحیثیت سے بھی اردوزبان کی عجیب وغریب مثنوی ہے۔سراپانگاری میں شوق نے بڑا کمال دکھایا ہے۔شوق کو بیگماتی زبان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔جس کے بہترین نمونے ہمیں ان کی مثنویوں میں ملتے ہیں۔اسی کا عکس ہمیں اس مثنوی میں صاف نظرآتا ہے۔

﴿۳﴾ زہرِعشق:۔مرزا شوقؔ کی تیسری اورآخری مثنوی ہے۔اس کی تصنیف کی تاریخ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔رشیدحسن کے خیال میں یہ مثنوی ۱۸۶۱ء کے قریبی زمانے میں لکھی گئی۔شاہ عبدالسلام کا کہنا ہے کہ یہ مثنوی ۱۸۶۰ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان میں تکمیل کو پہنچی۔ نظامی بدایونی نے اس کا سال تصنیف ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء بتایا ہے۔

رشیدحسن خاں ایک ذمہ دارمحقق ہیں اسی لئے ان کے سن تصنیف یعنی ۱۸۶۱ء ہی کومستند مانا جاسکتا ہے۔اس مثنوی کا پہلا ایڈیشن مرزا شوقؔ کی حیات میں ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔مطبع نول کشور نے اس کے دو ایڈیشن شائع کیے۔ایک شوقؔ کے انتقال سے دوسال پہلے یعنی ۱۸۶۹ء میں جب کہ دوسرا شوقؔ کے انتقال کے سال ۱۸۷۱ء میں شائع کیا۔اس کے بعد اس چھوٹی مثنوی کو بڑی ہی مقبولیت حاصل ہوئی اوراب تک اس کے بہت ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

08.06 مثنوی ''زہرِ عشق'' کا ماخذ

مثنویوں کے ماخذ کے متعلق ایک سوال عموماً کیا جاتا ہے کہ مرزا شوقؔ نے یہ مثنویاں کس کی مثنوی سے متاثر ہوکر یہ تصنیف کیں یا محض ان کے خیال کی جدت طرازی ہے۔اس سلسلے میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور کتاب ''مقدمۂ شعروشاعری'' میں تحریر کیا ہے کہ شوقؔ نے خواجہ میر اثرؔ دہلوی کی مثنوی ''خواب وخیال'' متاثر سے ہوکر اپنی مثنویاں لکھی ہیں۔حالیؔ لکھتے ہیں:

> ''بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی خواجہ میر اثرؔ دہلوی نے جو مثنوی لکھی ہے جس کا نام ''خواب وخیال'' رکھا تھا اور جس کی شہرت ایک خاص وجہ سے زیادہ تر پورب میں ہوئی تھی۔اس مثنوی میں جیسا کہ ہم نے اپنے احباب سے سنا ہے تقریباً چالیس یا پچاس اشعار اس قسم کے ہیں جیسے کہ شوق نے ''بہارِ عشق'' میں اختلاط کے موقع پر ان سے بہت زیادہ لکھے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ شوق کو ایسی صاف زبان برتنے کا خیال اسی مثنوی کو دیکھ کر پیدا ہوا۔''

(مقدمۂ شعروشاعری)

خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے بعد ۱۹۲۶ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مثنوی ''خواب وخیال'' انجمن ترقی کے اردو کے زیر اہتمام شائع کرائی اور اس پر ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا۔اس میں آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ مثنوی بہارِ عشق اور زہرِ عشق کا ماخذ، مثنوی خواب وخیال ہے اور بعض ایسے اشعار مثال میں پیش کیے جو مشابہت رکھتے ہیں مگر یہ اشعار بہارِ عشق کے ہیں۔بعض شعر تو بالکل ایک ہی جیسے لگتے ہیں جن کو دیکھنے کے بعد سرقہ یا توارد کے سوا اور کچھ نام نہیں دیا جاسکتا۔اس سلسلے میں اردو کے ممتاز نقادوں میں اختلاف رائے پیدا ہوا بعض ناقدین اس پر یقین رکھتے ہیں کہ زہرِ عشق اور بہارِ عشق کا ماخذ مثنوی خواب وخیال ہی ہے۔یہ مثنوی شوق کے مطالعے میں رہی ہے لیکن ایک گروہ اس رائے سے اختلاف رکھتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ:

> ''یہ تو مسلّم ہے کہ مرزا شوق نے بہارِ عشق میر اثر کی مثنوی خواب وخیال کو پڑھ کر لکھی تھی۔کیوں کہ دونوں میں سراپا اور اختلاط کے اشعار حرف بہ حرف ملتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ شوق کی ہر مثنوی میں ..... خواب وخیال کے کچھ نہ کچھ عناصر موجود ہیں۔''

(مقدمہ مثنوی زہرِ عشق مرتبہ....مجنوں مطبوعہ ایوان اشاعت گورکھ پور ۱۹۲۰ء)

حالاں کہ مجنوں کا یہ خیال غلط ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے محض انداز وقیاس پر لکھ دیا کہ سراپا اور اختلاط کے اشعار ملتے جلتے ہیں۔جب کہ مثنوی خواب وخیال میں سراپا کے پونے دوسو اشعار ہیں اور زہرِ عشق میں صرف پانچ چھ، لیکن بہارِ عشق میں اٹھارہ اشعار سراپا کے متعلق ہیں اور چند اشعار میں خواب وخیال سے مماثلت ہے لیکن زہرِ عشق میں کوئی شعر نہیں۔پھر اگر دو اشعار میں مشابہت نظر آئے تو اتفاقی کہہ سکتے ہیں جو اردو اور فارسی کی قریب قریب تمام مثنویوں میں ملے گی۔

واجد علی شاہ کی مثنوی دریائے عشق کے چند شعر بالکل زہرِ عشق سے ملتے ہیں اسی طرح اور بہت سی مثنویاں ہیں اس کے متعلق ساحلؔ بلگرامی کے خیالات توجہ کے قابل ہیں اور مسئلے کو حل کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ساحلؔ بلگرامی فرماتے ہیں:

''یہ کہنا کہ نواب مرزا نے اپنی مثنویوں کی بنیاد خواب وخیال پر رکھی تھی۔ سراسر عصبیت، طرف داری اور لاعلمی ہے۔ جن حضرات نے اردو ادب کا وسیع مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ نواب مرزا شوقؔ کی مثنویوں سے بہت پہلے واجد علی شاہ اور بادشاہ محل کی مثنویاں عالم وجود میں آ چکی ہیں۔ جن میں زبان کا وہ لطف اور چٹخارہ بدرجۂ اہم موجود ہے جو میرا اثر تو کیا دہلی کے کسی شاعر کو نصیب نہ ہو سکا۔''

(مضمون: مرزا شوق کی مثنوی۔ مطبوعہ نگار ماہ اکتوبر ۱۹۴۲ء)

بڑی تفصیل کے ساتھ اس مسئلے پر ساحلؔ بلگرامی نے بحث کی ہے، اور مختلف مثنویوں کے اشعار بطورِ مثال پیش کیے ہیں۔ اختلاف کا یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا اور اب تک اس کے متعلق کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی جس پر سب نے اتفاق کیا ہو۔ بلکہ اس اختلاف اور بحث کے پس پردہ، دہلویت اور لکھنویت کی روایتی کش مکش کا جلوہ نظر آتا ہے۔

08.07 مثنوی ''زہرِ عشق'' انتخاب: متن

ایک قصہ عجیب لکھتا ہوں — داستانِ غریب لکھتا ہوں
تازہ اِس طرح کی حکایت ہے — سننے والوں کو جس سے حیرت ہے
جس محلے میں تھا ہمارا گھر — وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
ایک دختر تھی اُس کی ماہ جبیں — شادی اُس کی نہیں ہوئی تھی کہیں
ثانی رکھتی نہ تھی وہ صورت میں — غیرتِ حور تھی حقیقت میں
اِس سِن و سال پر کمالِ خلیق — چال ڈھال انتہا کی نستعلیق
تھی زمانے میں بے عدیل و نظیر — خوش گلو، خوش جمال، خوش تقریر
تھا نہ اُس شہر میں جواب اُس کا — حُسن لاکھوں میں انتخاب اُس کا
شعر گوئی سے ذوق رہتا تھا — لکھنے پڑھنے کا شوق رہتا تھا
ایک دن چرخ پر جو اَبر آیا — کچھ اندھیرا سا ہر طرف چھایا
کھُل گیا جب برس کے وہ بادل — قوس تب آسماں پہ آئی نکل
دل مِرا بیٹھے بیٹھے گھبرایا — سیر کرنے کو بام پر آیا
دیکھا اک سمت جو اُٹھا کے نظر — سامنے تھی وہ دُخترِ سوداگر
ساتھ ہم جولیاں بھی تھیں دوچار — دیکھتی تھیں وہ آسماں کی بہار
ہوئی میری جو اُس کی چار نگاہ — منہ سے بے ساختہ نکل گئی آہ

تیرِ اُلفت جو تھا لگا کاری — اشک بے ساختہ ہوئے جاری
سامنے وہ کھڑی تھی ماہِ منیر — چپ کھڑا تھا مَیں صورتِ تصویر
اِسی صورت سے ہوگئی جب شام — لائی پاس اُس کے اک کنیز پیام
بیٹھی ناحق میں ہولیں کھاتی ہیں — امّاں جان آپ کو بلاتی ہیں
گیسو رُخ پر ہوا سے ہلتے ہیں — چلیے اب دونوں وقت مِلتے ہیں
سُن کے لونڈی کے منہ سے یہ پیغام — گئی کوٹھے کے نیچے وہ گل فام
اُس کا جلوہ نہ جب نظر آیا — مَیں بھی روتا ہوا اُتر آیا
گزرے کچھ دن جو رنج کے مارے — زرد رُخسار ہوگئے سارے
ہوگئی پھر تو ایسی حالتِ زار — جیسے برسوں کا ہو کوئی بیمار
دل کو تھی غم سے خود فراموشی — لگ گئی لب پہ مُہرِ خاموشی
رنج لاکھوں طرح کے سہتے تھے — لب تھے خاموش، اشک بہتے تھے
دیکھے ماں باپ نے جو یہ انداز — روح قالب سے کر گئی پرواز
پوچھا مجھ سے یہ کیا ہے حال ترا؟ — کس طرف ہے بندھا خیال ترا؟
سچ بتادے کہ دھیان کس کا ہے؟ — دل میں غم میری جان کس کا ہے؟
رنج کس شعلہ رُو کا کھاتے ہو؟ — شمع کی طرح پگھلے جاتے ہو
کون سی ماہ رُو پہ مَرتے ہو؟ — سچ کہو، کس کو پیار کرتے ہو؟
کھاتے ہو، پیتے ہو، نہ سوتے ہو — روز اُٹھ اُٹھ کے شب کو روتے ہو
میرے بچے کی جو کڑھائے جان — سات بار اُس کو مَیں کروں قربان
اللہ آمیں سے ہم تو یوں پالیں — آپ آفت میں جان یوں ڈالیں
تیرے پیچھے کی تلف سب اوقات — دن کو دن سمجھی اور نہ رات کو رات
پالا کس کس طرح تمہیں جانی — کون منت تھی جو نہیں مانی
روشنی مسجدوں میں کرتی تھی — جاکے درگاہ چوکی بھرتی تھی
اب جو نامِ خدا جوان ہوئے — ایسے مختار میری جان ہوئے
ہاں میاں سچ ہے، یہ خدا کی شان — تم کرو جان بوجھ کر ہلکان
ہم تو یوں پھونک پھونک رکھیں قدم — آپ دیتے پھریں ہر ایک پہ دم
ہم یہاں رنج وغم میں روتے ہیں — آپ غیروں پہ جان کھوتے ہیں

یوں ستاؤگے جان کر ہم کو
تھی نہ اِس روز کی خبر ہم کو

دیکھتی ہوں جو تیرا حالِ زبوں
خشک ہوتا ہے میرے جسم کا خوں

یوں تو برباد تُو شباب نہ کر
مٹی ماں باپ کی خراب نہ کر

کچھ تو کہہ ہم سے اپنے قلب کا حال
کس کا بھایا ہے تجھ کو حسن و جمال؟

دل ہوا تیرا شیفتہ کس کا؟
سچ بتا ہے فریفتہ کس کا؟

کیسا دو دن میں جی نڈھال ہوا
دائی بندی کا کیا یہ حال ہوا

آئنہ تو اُٹھا کے دیکھ ذرا
سُت گیا دو ہی دن میں منہ کیسا

سُدھ نہ کھانے کی ہے نہ پینے کی
کون سی پھر اُمید جینے کی؟

کس کی اُلفت میں ہے یہ حال کِیا؟
کُچھ نہ ماں باپ کا خیال کیا

دل پہ گزرا ہے کیا ملال تُو کہہ
منہ سے ناشدنی اپنا حال تُو کہہ

یوں ہی گر ہو گیا تُو سودائی
دُور پہنچے گی اِس کی رسوائی

ایسے دیوانے کو بھرے گا کون؟
شادی اور بیاہ پھر کرے گا کون؟

کر دیا کس نے ایسا آوارہ؟
کہ نہیں بنتا اب کوئی چارہ

میرے تو دیکھ کر گئے اوسان
لیلیٰ مجنوں کے تُو نے کاٹے کان

باتیں یہ والدین کی سُن کر
اور اک قلب پر لگا نشتر

شرم کے مارے منہ کو ڈھانپ لیا
کچھ نہ ماں باپ کو جواب دیا

چھلکے آنکھوں کے دونوں پیمانے
دل لگا آپ ہی آپ گھبرانے

گرم نالے تھے، لب پہ آہ تھی سرد
دل میں ہوتا تھا میٹھا میٹھا درد

ہوگئی جب کمال حالتِ زار
شب کو رہنے لگا اُسے بھی بخار

نہ رُکا اُس کے روکے سے دلِ زار
جی میں باقی رہا نہ صبر و قرار

لکھنے پڑھنے سے تھا جو اُس کو ذوق
سوچ کر دل میں لکھا اک خطِ شوق

بھیجا مجھ کو وہ بے خطر نامہ
ڈر سے لکھا نہ اُس پہ سَرنامہ

ایک ماما نے آکے چپکے سے
خط دِیا اُس کا ہاتھ میں میرے

کھول کر میں نے جو اُسے دیکھا
کچھ عجب درد سے یہ لکھا تھا

ہو یہ معلوم تم کو بعدِ سلام
غمِ فرقت سے دل ہے بے آرام

اپنے کوٹھے پہ تُو نہیں آتا
دل ہمارا بہت ہے گھبراتا

شکل دِکھلا دے کبریا کے لئے بام پر آ ذرا خدا کے لئے
اِس محبت پہ ہو خدا کی مار جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار
اب کوئی اِس میں کیا دلیل کرے جس کو چاہے خدا ذلیل کرے
پڑھ کے مَیں نے لکھا یہ اُس کو جواب کیا لکھوں تم کو اپنا حالِ خراب
بن گئی یاں تو جان پر میری خوب لی آپ نے خبر میری
ہجر میں مَر کے زندگانی کی اب بھی پوچھا تو مہربانی کی
جب سے دیکھا ہے آپ کا دیدار دل سے جاتا رہا ہے صبر و قرار
روز تَپ سے بخار رہتا ہے سر پہ اک جن سوار رہتا ہے
پوچھتا ہے جو کوئی آ کر حال اور ہوتا ہے میرے دل کو ملال
کہوں کس کس سے اِس کہانی کو آگ لگ جائے اِس جوانی کو
ہل کے پانی پیا نہیں جاتا ورنہ حکم آپ کا بجا لاتا
پاتا طاقت جو طالبِ دیدار بام پر آتا دن میں سَو سَو بار
پہنچا جس وقت سے ترا مکتوب زندگی کا بندھا ہے کچھ اُسلوب
رنج، راحت سے گر بدل جائے کیا عجب ہے جو دل سنبھل جائے
نہیں ممکن تمہارا بل جائے دم بھی عاشق کا گر نکل جائے
غیر ہے ہجر سے مِری حالت غم اُٹھانے کی اب نہیں طاقت
دل پہ آفت عجیب آئی ہے جان بچ جائے تو خدائی ہے
جھوٹ سمجھیں اِسے حضور! نہیں جان جاتی رہے تو دُور نہیں
مَر گئے ہم تو رنجِ فرقت سے پر خبر کی نہ اپنی حالت سے
اب جو بھیجی یہ آپ نے تحریر ہے یہ لازم کہ وہ کرو تدبیر
سختیاں ہجر کی بدل جائیں دل کی سب حسرتیں نکل جائیں
دے کے خط مَیں نے یہ کہا اُس سے جلد اِس کا جواب لا اُس سے
پہنچا جب اُس تلک مِرا مکتوب ہنس کے بولی کہ واہ وا کیا خوب
پھر کیا یہ جواب میں تحریر کچھ قضا تو نہیں ہے دامن گیر
ذکر اِن باتوں کا یہاں کیا تھا؟ چھیڑنے کو ترے یہ لکھا تھا
ایسی باتیں تھیں کب یہاں منظور؟ تھا فقط تیرا امتحاں منظور

یہ تو لکھے تھے سب ہنسی کے کلام
ورنہ اِن باتوں سے مجھے کیا کام؟

تُم پہ مَیں مَرتی، کیا قیامت تھی؟
کیا مِرے دشمنوں کی شامت تھی؟

یہ نہ سمجھا کہ ماجرا کیا ہے؟
یوں بھی کوئی کسی کو لکھتا ہے؟

کالا دانا ذرا اُتَروالو
رائی لَون اِس سمجھ پہ کر ڈالو

تجھ پر مَرتے بھی گر مِرے بدخواہ
یوں نہ لکھتی کبھی معاذ اللہ

جان پاپوش سے نکل جاتی
پر طبیعت نہ یوں بدل جاتی

کیا سمجھ کر لکھا تھا یہ مضمون؟
اچھی ہوتی نہیں ہے اتنی دُون

دیکھ تحریر فیل لائے آپ
خوب جلدی مزے میں آئے آپ

طالبِ وصل جو ہوئے ہم سے
ہے گا سادہ مزاج جم جم سے

رہی کچھ روز تو یہی تحریر
پھر موافق ہوئی مِری تقدیر

ہوئے اُس گل سے وصل کے اقرار
اُٹھ گئی درمیاں سے سب تکرار

جو کہا تھا، ادا کیا اُس نے
وعدہ اک دن وفا کیا اُس نے

رات بھر میرے گھر میں رہ کے گئی
صبح کے وقت پھر یہ کہہ کے گئی

بات اِس دَم کی یاد رکھیے گا
ایک دن یہ مزا بھی چکھیے گا

بگڑے گی جب نہ کچھ بن آئے گی
آپ کے پیچھے جان جائے گی

لو مِری جان جاتی ہوں اب تو
یاد رکھیے گا میری صحبت کو

جو خدا پھر ملائے گا تم سے
تو کہوں گی پھر حال آ تم سے

سن کے مَیں نے دیا یہ اُس کو جواب
نہ کرو دل کو اِس قدر بے تاب

کہتی تم کیا ہو یہ، خدا نہ کرے
یہ ستم ہووے، کبریا نہ کرے

عمر بھر ہم وفا نہ توڑیں گے
زندگی بھر نہ منہ کو موڑیں گے

پیار کرتی جو تھی وہ غیرتِ حور
رکھا ملنے کا اُس نے یہ دستور

پنج شنبہ کو جاتی تھی درگاہ
وہاں سے آتی تھی میرے گھر وہ ماہ

عیش ہونے لگے مِرے اُن کے
غیر جلنے لگے یہ سُن سُن کے

اتفاق ایسا پھر ہوا ناگاہ
دو مہینے تلک نہ آئی وہ ماہ

قطع سب ہوگئے پیام و سلام
نہ رہی شکلِ راحت و آرام

طبع کو ہوگئی پریشانی
عقل کو تھی عجیب حیرانی

دل کو تشویش تھی یہ حد سے زِیاد
دفعتاً پڑ گئی یہ کیا اُفتاد؟

تھی نہ مجھ سے یہاں کسی کو لاگ
کس نے اِس طرح کی لگائی آگ؟

دل میں اُس کے یہ کس نے بل ڈالا؟
جو مِرے عیش میں خلل ڈالا

کچھ تو ایسا ہوا ہے افسانا
جو یہاں تک نہ ہو سکا آنا

نہیں معلوم کیا پڑی اُفتاد؟
جو فراموش کی ہماری یاد

جان آنکھوں میں کھنچ کے آئی ہے
اب نہیں طاقتِ جدائی ہے

دو مہینے نہ دیکھے جب گُل کو
چین کس طرح آئے بلبل کو؟

طبع کس طرح پھر بہل جائے؟
جسم سے روح جب نکل جائے

آئی نوچندی اتنے میں ناگاہ
اِس بہانے سے آئی وہ درگاہ

بس کہ مَرتی تھی نام پر میرے
چھپ کے آئی وہاں سے گھر میرے

تھی نہ فرصت جو اشک باری سے
اُتری روتی ہوئی سواری سے

پھر لپٹ کر مِرے گلے اک بار
حال کرنے لگی وہ یوں اظہار

اقربا میرے ہوگئے آگاہ
تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ

مشورے یہ ہوئے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

وہ چُھٹے ہم سے، جس کو پیار کریں
جبر کیوں کر یہ اختیار کریں

گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس
پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس

جائے عبرت سرائے فانی ہے
موردِ مرگ نوجوانی ہے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اُس جا ہے آشیانۂ بُوم

بات کل کی ہے، نوجواں تھے جو
صاحبِ نوبت و نشاں تھے جو

آج خود ہیں ، نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرتِ حور، مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہِ ہفت اقلیم
ہوئے جا جا کے زیرِ خاک مقیم

کوئی لیتا نہیں اب اُس کا نام
کون سی گور میں گیا بہرام

اب نہ رُستم ، نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے

تھے جو خود سر جہان میں مشہور
خاک میں مل گیا سب اُن کا غرور

عطر مٹی کا جو نہ مَلتے تھے — نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردشِ چرخ سے ہلاک ہوئے — اُستخواں تک بھی اُن کے خاک ہوئے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور — باقی اُن کے نہیں نشانِ قبور
تاج میں جن کے ٹنکتے تھے گوہر — ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسۂ سر
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے — یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہ کن کا پتا — نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
بوئے الفت تمام پھیلی ہے — باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائرانِ خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیھا فان
موت سے کس کو رُستگاری ہے؟ — آج وہ، کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اِس میں — موت عینِ حیات ہے اِس میں
ہم بھی گر جان دے دیں کھا کر سَم — تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہم جولیوں میں بہلانا — یا مِری قبر پر چلے آنا
جا کے رہنا نہ اِس مکان سے دور — ہم جو مَر جائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی، گر نہ پائے گی — ڈھونڈنے کس طرف کو جائے گی؟
روکے رہنا بہت طبیعت کو — یاد رکھنا مِری وصیت کو
ضبط کرنا اگر ملال رہے — میری رسوائی کا خیال رہے
میرے مَرنے کی جب خبر پانا — یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہولیں سب اَقربا جس دم — رکھنا اُس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم — ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی — دور پہنچے گی اِس کی رسوائی
لاکھ تم کچھ کہو، نہ مانیں گے — لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر — قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
سامنا ہو ہزار آفت کا — پاس رکھنا ہماری عزت کا
جب جنازہ مِرا عزیز اُٹھائیں — آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت پہ دھیان رکھیے گا — بند اپنی زبان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مِرا — نام منہ سے نہ لیجیے گا مِرا

اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا
ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا

رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں
منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں

ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھُلے
تا کسی شخص پر نہ حال کھُلے

ہوتے آفت کے ہیں یہ پرکالے
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے

ذکر سُن کر مِرا نہ رو دینا
میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

رنجِ فرقت مِرا اُٹھا لینا
جی کسی اور جا لگا لینا

ہوگا کچھ میری یاد سے نہ حصول
دل کو کرلینا اور سے مشغول

رنج کرنا نہ میرا، مَیں قربان
سُن لو، گر اپنی جان ہے تو جہان

دے نہ اُس کو خدا کبھی کوئی درد
ہوتا نازک کمال ہے دلِ مَرد

دل میں کُڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تُو
جان دینا نہ گھُوٹ گھُوٹ کے تُو

آکے رو لینا میری قبر کے پاس
تانکل جائے تیرے دل کی بھڑاس

آنسو چپکے سے دو بہا لینا
قبر میری گلے لگا لینا

اگر آجائے کچھ طبیعت پر
پڑھنا قرآن میری تربت پر

غنچۂ دل مِرا کِھلا جانا
پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

دیکھیے کس طرح پڑے گی کَل
سخت ہوتی ہے منزلِ اوّل

میرے مرقد پہ روز آنا تم
فاتحہ سے نہ ہاتھ اُٹھانا تم

ہے یہ حاصل سب اتنی باتوں سے
مٹّی دینا تم اپنے ہاتھوں سے

عمر بھر کون کس کو روتا ہے؟
کون صاحب کسی کا ہوتا ہے؟

کبھی آجائے گر ہمارا دھیان
جاننا ہم پہ ہوگئی قربان

دل میں کچھ آنے دیجیو نہ ملال
خواب دیکھا تھا کی جیو یہ خیال

رنج و راحت جہاں میں توأم ہے
کہیں شادی ہے اور کہیں غم ہے

پھر ملاقات دیکھیں ہو کہ نہ ہو
آج دل کھول کر گلے مل لو

خوب سا آج دیکھ بھال لو تم
دل کی سب حسرتیں نکال لو تم

آؤ اچھی طرح سے کر لو پیار
کہ نکل جائے کچھ تو دل کا بخار

دل میں باقی رہے نہ کچھ ارمان
خوب مل لو گلے سے، مَیں قربان

حشر تک ہوگی پھر یہ بات کہاں؟
ہم کہاں، تم کہاں، یہ رات کہاں؟

کہہ لو، سن لو، جو کچھ کہ جی میں آئے
پھر خدا جانے کیا نصیب دِکھائے

دل کو اپنے کرو ملول نہیں
رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں

عمر تم کو تو ہے ابھی کھینا
دن بہت سے پڑے ہیں، رو لینا

بانہیں دونوں گلے میں ڈال لو آج
جو جو ارمان ہوں، نکال لو آج

پھر خدا جانے کیا مشیّت ہے؟
اتنی صحبت بہت غنیمت ہے

کس کو کل بیٹھ کر کروگے پیار؟
کس کی لو گے بلائیں تم ہر بار؟

کل گلے سے کسے لگاؤگے؟
یوں کسے گود میں بٹھاؤگے؟

حال کس کا سنائے گی آ کر؟
کس کی ماما بلائے گی آ کر؟

ہم تو اُٹھتے ہیں اِس مکان سے کل
اب تو جاتے ہیں اِس جہان سے کل

یاد اِتنی تمہیں دِلاتے جائیں
پان کل کے لئے لگاتے جائیں

ہو چکا آج جو کہ تھا ہونا
کل بسائیں گے قبر کا کونا

خاک میں ملتی ہے یہ صورتِ عیش
پھر کہاں ہم، کہاں یہ صحبتِ عیش؟

دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے
کوئی آتا نہیں ہے پھر مَر کے

ختم ہوتی ہے زندگانی آج
خاک میں ملتی ہے جوانی آج

چپ رہو، کیوں عبث بھی روتے ہو؟
مفت کاہے کو جان کھوتے ہو؟

سمجھو اِس کو شبِ برات کی رات
ہم ہیں مہماں تمہارے رات کی رات

اب تم اتنی دعا کرو مِری جان
کل کی مشکل خدا کرے آسان

پھل اُٹھایا نہ زندگانی کا
نہ مِلا کچھ مزا جوانی کا

دل میں لے کر تمہاری یاد چلے
باغِ عالم سے نامراد چلے

عشق کا نام کیوں ڈبو جائیں؟
آج ہی جان کیوں نہ کھو جائیں؟

جب تلک چرخِ بے مدار رہے
یہ فسانہ بھی یادگار رہے

بولی گھبرا کے پھر ٹھہر مِری جان!
کچھ سنا بھی کہ کیا بجا اِس آن

حسرتِ دل نگوڑی باقی ہے
اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے

گود میں اپنی پھر بٹھالو جان!
پھر گلے سے ہمیں لگالو جان!

ڈال دو پھر گلے میں ہاتھوں کو
پھر گلوری چبا کے منہ میں دو

پھر کہاں ہم، کہاں یہ صحبتِ یار؟
کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار

پھر مِرے سر پہ رکھ دو سر اپنا
گال پھر رکھ دو گال پر اپنا

پھر اُسی طرح منہ کو منہ سے مَلو
پھر وہی باتیں پیار کی کر لو

پھر ہم اُٹھنے لگیں بٹھالو تم
پھر بگڑ جائیں ہم منالو تم

پھر بلائیں تمہاری یار لیں ہم
آؤ پھر سر سے سر اُتار لیں ہم

رو نہ اِس طرح سے تُو زار و قطار
دشمنوں کو کہیں چڑھے نہ بخار

آپ اچھے بھلے بچھڑ جائیں
اور لینے کے دینے پڑ جائیں

کاٹ لے کوئی دھڑ سے سر میرا
بال بیکا نہ ہو مگر تیرا

میں دل و جاں سے ہوں فدا تیری
لے کے مَر جاؤں میں بلا تیری

اب تُو کیوں ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے؟
کیوں مِرے دل کے ٹکڑے کرتا ہے؟

میں ابھی تو نہیں گئی ہوں مَر
کیوں سُجائی ہیں آنکھیں رو رو کر؟

اِس قدر ہو رہا ہے کیوں غم گیں؟
کیوں مٹاتا ہے اپنی جانِ حزیں؟

کر نہ رو رو کے اپنا حال زبوں
ارے ظالم! ابھی تو جیتی ہوں

ایسے قصے ہزار ہوتے ہیں
یوں کہیں مردوے بھی روتے ہیں؟

یوں تو آنسو نہ تُو بہا اپنے
دل کو مضبوط رکھ ذرا اپنے

رنج سے میرے کچھ اُداس نہ ہو
یوں تو لِلّٰہ بدحواس نہ ہو

تم تو اتنے میں ہوگئے رنجور
تھک گئے، اور ابھی ہے منزل دور

اِسی غم نے تو مجھ کو مارا ہے
صدمہ تیرا نہیں گوارا ہے

اپنے مَرنے کا کچھ نہیں ہے اَلم
دل میں میرے فقط ہے اِس کا غم

جان ہم نے تو اِس طرح کھوئی
کون تیری کرے گا دل جوئی؟

آ کے سمجھائے گا، بجھائے گا کون؟
اِس طرح سے گلے لگائے گا کون؟

کون روکے گا اِس طبیعت کو؟
کس سے کہہ جاؤں اِس وصیّت کو؟

مَیں کہاں ہوں؟ جو ساتھ دوں تیرا
ہاتھ میں کس کے ہاتھ دوں تیرا؟

یوں تسلّی تِری کرے گا کون؟
میری صورت پہ پھر مَرے گا کون؟

کون یوں خوش کرے گا جی تیرا؟
دل ہے اِس غم سے مضمحل میرا

جی لگے گا نہ ساتھ میں اِس کا
دل لیے رہنا ہاتھ میں اِس کا

پر مَیں اب اِس کو کیا کروں کم بخت!
آسماں دور ہے، زمیں ہے سخت

گو کہ عقبیٰ میں رُوسیاہ چلی
مگر اپنی سی مَیں نباہ چلی

جی کو تم پر فدا کیا مَیں نے
حق وفا کا ادا کیا مَیں نے

بولی پھر زانوؤں پہ مار کے ہاتھ
نہیں معلوم اب ہے کتنی رات؟

جوں جوں گھڑیال وہ بجاتا ہے
جی مِرا سَن سَنایا جاتا ہے

یوں تو کوئی نہ درد وغم میں کُڑھے
پھولے جاتے ہیں ہاتھ پاؤں مِرے

کچھ عجب ہو رہا ہے جا ن کا طَور
کہتی ہوں کچھ، نکلتا ہے کچھ اَور

آنسو آنکھوں میں بھر بھر آتے ہیں
دست و پا سارے تھرتھراتے ہیں

دل کو سمجھاتی ہوں مَیں بہتیرا
پر سنبھلتا نہیں ہے جی میرا

گو تُو بیٹھا ہوا ہے پاس مِرے
پر ٹھکانے نہیں حواس مِرے

ہوش آئے ہوئے بھی جاتے ہیں
دل میں کیا کیا خیال آتے ہیں

خاک تسکینِ جانِ زار کریں
اب وصیّت کریں کہ پیار کریں؟

سُن کے مَیں نے دیا یہ اُس کو جواب
دل کو میرے بس اب کرو نہ کباب

مجھ پہ یہ دن تو کبریا نہ کرے
تم مَرو، مَیں جیوں، خدا نہ کرے

جان دے دوگی تم جو کھا کر سَم
مَیں بھی مَر جاؤں گا خدا کی قسم

جو یہ دیکھے گا، خوب روئے گا
آگے پیچھے جنازہ ہووے گا

اک ذرا مجھ سے تو کہو یہ حال
جی میں کیا آیا آپ کے یہ خیال؟

دل ہی دل میں اَلم اُٹھاتی ہو
جان دیتی ہو، زہر کھاتی ہو

پہنچا ماں باپ سے اگر ہے اَلم
اِس کا کرنا نہ چاہیے تمہیں غم

جو کہ ہوتے ہیں قوم کے اشراف
یوں ہی کرتے ہیں وہ قصورمعاف

کچھ تمہی پر نہیں ہے یہ اُفتاد
سب کے ماں باپ ہوتے ہیں جلّاد

صدمہ ہر اک پہ یہ گزرتا ہے
زہر کھا کھا کے کوئی مَرتا ہے

شکوہ ماں باپ کا تو ناحق ہے
اُن کا اولاد پر بڑا حق ہے

ہوں جو ناراض یہ، قیامت ہے
اِن کے قدموں کے نیچے جنت ہے

تم تو نامِ خدا سے ہو دانا
اُس پہ رتبہ نہ اُن کا پہچانا؟

کیا بھروسہ حیات کا اُن کی؟
نہ بُرا مانو بات کا، اُن کی

ہوش رہتے نہیں ہیں اِس سِن کے
یہ تو مہمان ہیں کوئی دن کے

اتنی سی بات کا غبار ہے کیا؟ اُن کے کہنے کا اعتبار ہے کیا؟
غور سے کیجیے جو دل میں خیال اُن کا غصہ نہیں ہے جائے ملال
سُن کے اُس نے دیا یہ مجھ کو جواب ہم نے دیکھی نہیں ہے چشمِ عتاب
بے حیا ایسی زندگی کو سلام منہ پہ آئے نہ تھے کبھی یہ کلام
طعنے سنتی ہوں دو مہینے سے موت بہتر ہے ایسے جینے سے
خونِ دل کب تلک پیے کوئی؟ بے حیا بن کے کیا جیے کوئی؟
نوعِ انسان بے حمیّت ہو آدمی کیا؟ نہ جس کو غیرت ہو
وہ سنے جس کو اِس کی عادت ہے اِس میں کیا؟ اپنی اپنی غیرت ہے
پر مِرے جیتے جی تو بہرِ خدا اپنے مَرنے کا ذکر منہ پہ نہ لا
کون سا پڑ گیا ہے رنج و محن؟ جان کیوں دیں گے آپ کے دشمن؟
تم نے جی دینے کی جو کی تدبیر حشر کے روز ہوں گی دامن گیر
تُو سلامت جہاں میں رہ مِری جان! نکلیں ماں باپ کے ترے ارمان
واسطے میرے اپنا دل نہ کُڑھا چاند سی بنّو گھر میں بیاہ کے لا
ہے یہی لطف زندگانی کا دیکھ سُکھ اپنی نوجوانی کا
چار دن ہے یہ نالہ و فریاد عمر بھر کون کس کو کرتا ہے یاد؟
لطف دنیا کے جب اُٹھاؤ گے ہم کو دو دن میں بھول جاؤ گے
تھا یہی ذکر جو بجا گھڑیال سنتے ہی اُس کے، ہوگئی بے حال
ہو گیا فرطِ غم سے چہرہ زرد دست و پا تھرتھرا کے ہوگئے سرد
مُردنی رُخ پہ چھا گئی اُس کے دل میں وحشت سما گئی اُس کے
دل میں گزرا جو اُس کے صبح کا شک ہوئی استادہ جا کے زیرِ فلک
ٹھنڈی جس دم چلی نسیمِ سحر ہو گیا حال اور بھی ابتر
اتنے میں صبح کی بجی وردی دُونی چہرے کی ہو گئی زردی
ہوئے ثابت جو صبح کے آثار ہو گئی اور اُس کی حالت زار
بید کی طرح جسم لہرایا سر سے لے پاؤں تک عرق آیا
باتیں کرنی جو تھیں، سو بھول گئی دَم لگا چڑھنے، سانس پھول گئی
بولی گھبرا کے، رہیو اِس کے گواہ اور کہا لا الہٰ الا اللہ

اب فقط یہ ہے خوں بہا میرا بخش دیجو کہا سنا میرا
کہہ کے یہ، پھر چمٹ گئی اک بار اور کیا خوب بھینچ بھینچ کے پیار
سر سے لے کر بلائیں تا بہ قدم بولی تم پر نثار ہوتے ہیں ہم
آگ لگ جائے وہ گھڑی کم بخت بام پر آئی تھی مَیں کون سے وقت؟
پھر یہ بولی: وہ پونچھ کر آنسو میرے سَر کی قسم نہ کُڑھیو تُو
آزماتی تھی تجھ کو، کستی تھی میں ترے چھیڑنے کو ہنستی تھی
کہہ کے یہ بات ہوگئی وہ سوار یاں بندھا آنسوؤں کا آنکھ سے تار
آتشِ غم بھڑک گئی دُونی تپشِ قلب نے کی اَفزونی
یاد آتی تھی جب وصیّتِ یار وہم لاتا تھا دل ہزار ہزار
تھی مصیبت جو یہ بلا انگیز دھیان آتے تھے کیا کیا وحشت خیز
دل میں کہنے کا اُس کے، تھا جو ملال آتے تھے ذہن میں عجیب خیال
کون روکے گا جا کے؟ گھر بیٹھے جو کہا ہے وہی نہ کر بیٹھے
ہر گھڑی تھا جو اضطراب فزوں چپکا روتا تھا بیٹھا مَیں محزوں
کہ اُٹھا ایک سمت سے وہ غُل ہوش جس سے کہ اُڑ گئے بالکل
یوں تو گزرے تھے دو پہر روتے اور ہاتھوں کے اُڑ گئے طوطے
ہو گیا دل کو اِس طرح کا ہراس آئے سَو سَو طریق کے وَسواس
کہا اک دوست سے کہ تم جا کر جلد اِس شور و غُل کی لاؤ خبر
روتے ہیں ہم سے بدنصیب کوئی مَر گیا اُن کا کیا حبیب کوئی؟
یوں جو اپنی یہ جان کھوتے ہیں کون ہیں؟ کس لئے یہ روتے ہیں؟
دوڑے آخر اُدھر مِرے احباب لے کے آئے خبر وہاں سے شتاب
کیا اِس طرح آ کے مجھ سے بیان کہ یہاں سے ہے اک قریب مکان
باغ کے پاس جو بنا ہے گھر واں فروکش ہے ایک سوداگر
یوں تو اک شور راہ بھر میں ہے پر یہ آفت اُنہی کے گھر میں ہے
صاف کھُلتا نہیں ہے یہ اسرار مَر گیا کوئی یا کہ ہے بیمار؟
پر یہ ہوتا ہے عقل سے ادراک کہ نہیں بے سبب اُڑاتے خاک
نہیں برپا یہ بے سبب ماتم ہے نکلتا کسی جوان کا دَم

ہر بشر ہو رہا ہے دیوانہ
کوئی مَرتا ہے صاحبِ خانہ

تھمتا اک دم بھی واں خروش نہیں
کس سے پوچھیں؟ کسی میں ہوش نہیں

روتے جس درد سے ہیں وہ اِس دَم
دیکھا جاتا نہیں خدا کی قسم

کہہ گئی تھی جو وہ کہ کھاؤں گی زہر
میں یہ سمجھا کہ ہوگیا وہی قہر

گو حیاسے نہ اُس کا نام لیا
دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام لیا

دوستوں نے جو دیکھی یہ صورت
بولے اِس طرح از رہِ الفت

حالِ دل یوں تمہارا غیر جو ہے
مگر اِس وقت کیا ہے؟ خیر تو ہے؟

بے سبب کس لئے ہوئے ہو اُداس؟
اُڑ گئے کیوں تمہارے ہوش وحواس؟

کون سی آفت آگئی اِس دَم؟
مُردنی منہ پہ چھا گئی اِس دَم

کیا ہے جو اتنے بے قرار ہو اب؟
کوئی مَر جائے، اُس سے کیا مطلب؟

ایسی حالت جو پیچ و تاب کی ہے
تم کو کیا وجہ اضطراب کی ہے؟

شہر میں روز لوگ مرتے ہیں
خفقاں اِس کا کوئی کرتے ہیں؟

سُن کے ماں باپ کیا کہیں گے؟ بتاؤ
ہوش پکڑو، ذرا حواس میں آؤ

تم کو کیا ہے؟ جو جان کھوتے ہو
بے سبب آپ ہی آپ روتے ہو

نہ دیا اُن کو مارے غم کے جواب
ڈھانپ کر منہ کیا بہانۂ خواب

حالِ دل سینے میں ہوا جو تباہ
بیٹھا کمرے میں آن کر سرِراہ

دیکھا، برپا ہے ایک حشر کا غُل
بھیڑ سے بند راہ ہے بالکل

اُس طرف سے جو لوگ آتے ہیں
یہی آپس میں کہتے جاتے ہیں

حال اُن کا بھی جائے رِقت ہے
داغ اولاد کا قیامت ہے

نوچ ڈالے ہیں سارے سر کے بال
کیا پریشاں ہے والدین کا حال

آفتِ تازہ سر پہ ہے آئی
بگ رہے ہیں مثالِ سودائی

دھیان اُن کی طرف جو جاتا ہے
غم سے منہ کو کلیجہ آتا ہے

جو کہ تھے اُن میں صاحبِ اولاد
حال ابتر تھا اُن کا حد سے زِیاد

کہتے تھے کوٹ کر سر و سینہ
کیوں نہ دشوار اُن کو ہو جینا

مَرگ اولاد کا، وہ ماتم ہے
رنج وغم جس قدر کریں، کم ہے

کوئی کہتا تھا: کیسی آفت ہے ؟
نوجواں مَرنا بھی قیامت ہے

کوئی بولا کہ ہے سبھی کو ملال
دیکھا جاتا نہیں ہے باپ کا حال

نہیں دم بھر کسی کو واں آرام
دیکھنے والے رو رہے ہیں تمام

پھوڑ ڈالے ہیں سب نے سر اپنے
سر و پا کی نہیں خبر اپنے

بنیے، بقال جان کھوتے ہیں
سارے دوکان دار روتے ہیں

حال دیکھا جو مَیں نے یہ اُٹھ کر
ہل گیا سینے میں دلِ مضطر

نہ رہی تاب رنج کے مارے
لگے تھرانے دست و پا سارے

عشق کی تھی جو دل کو بیماری
غش کا عالم سا ہو گیا طاری

دو گھڑی بعد پھر جو آیا ہوش
دیکھا برپا عجب ہے جوش و خروش

آگے آگے ہے کچھ جلوس رواں
سر کھلے، پیچھے کچھ ہیں پیر و جواں

سن رسیدہ ہیں عورتیں کچھ ساتھ
سینہ و سر پہ مارتی ہیں ہاتھ

کوئی ماما ہے، کوئی دائی ہے
کوئی امّا، کوئی کِھلائی ہے

جب وہ بھرتی ہیں غم سے آہِ سرد
سننے والوں کے دل میں ہوتا ہے درد

ہوتا غیروں کو ہے ملال اُن کا
دیکھا جاتا نہیں ہے حال اُن کا

کچھ بیاں ایسے ہوتے جاتے ہیں
راستے والے روتے جاتے ہیں

شامیانہ نیا، زَری کا ہے
نیچے تابوت اُس پری کا ہے

سہرا اُس پر بندھا ہے اک زرتار
جیسے گلشن کی آخری ہو بہار

تھی پڑی اُس پہ ایک چادرِ گل
جس سے خوشبو نکلتی تھی بالکل

عُود سوز آگے آگے روشن تھے
مَر گئے، پھر بھی لاکھ جوبن تھے

بھیڑ تابوت کے، تھی ایسی ساتھ
جیسے آئے کسی دلہن کی برات

سب وضیع و شریف تھے ہم راہ
بھیڑ تھی اِس قدر کہ بند تھی راہ

ساتھ تھے خویش و اَقربا سارے
رو رہے تھے غریب بے چارے

آگے آگے جنازہ جاتا تھا
غش اُسے ہر قدم پہ آتا تھا

ہاتھ تھامے تھے اَقربا سارے
تا کسی جا پہ سر نہ دے مارے

سب امیر و فقیر روتے تھے
دیکھ کر راہ گیر روتے تھے

پیچھے سب کے فِنِس میں تھی مادر
کہتی جاتی تھی اِس طرح رو رو کر

تیری میّت پہ ہو گئی مَیں نثار
کم سخن، ہائے میری غیرت دار

دل پہ جو گزری، کچھ بیان نہ کی
کچھ وصیّت بھی میری جان نہ کی

کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو
کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو؟

دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں
بیٹا! اِس ماں کو کس پہ چھوڑ گئیں؟

تازہ، پیدا جگر پہ داغ ہوا
گھر مِرا آج بے چراغ ہوا

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے
جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے

زہر دے دے کوئی، مَیں کھا جاؤں
یا زمیں شق ہو، مَیں سما جاؤں

داغ تیرا جگر جلاتا ہے
چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے

مٹ گیا لطف زندگانی کا
دل کو غم ہے تِری جوانی کا

بیاہ تیرا رچانے پائی نہ مَیں
کوئی منّت بڑھانے پائی نہ مَیں

تیری صورت کے ہوگئی قربان
چلیں دنیا سے کیسی پُر ارمان

ہوئیں کس بات پر خفا؟ بولو
امّاں واری، ذرا جواب تو دو

بولتیں تم نہیں پکارے سے
اب جیوں گی میں کس سہارے سے؟

کیا قضانے جگر پہ داغ کیا
آج گھر میرا بے چراغ کیا

نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارمان
ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پروان

ایسی اِس ماں سے ہوگئیں بے زار؟
لی نہ خدمت بھی پڑکے کچھ بیمار

نہ جیوں گی ترے فراق میں مَیں
دل تڑپتا ہے، آنکھیں ڈھونڈتی ہیں

کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا؟
کوکھ میری اُجڑ گئی بیٹا

عمر کٹنی تھی ایسے صدمے میں
ٹھوکریں تھیں بدی بڑھاپے میں

سن کے اِس طرح اُس کی ماں کے بین
اور سینے میں دل ہوا بے چین

تھی وصیّت جو اُس پری کی یاد
سب کے پیچھے مَیں ہو لیا ناشاد

پیچھے اُن سب کے جو رواں تھا مَیں
صورتِ گردِ کارواں تھا میمَیں

گہ تڑپتا تھا صورتِ بسمل
بیٹھ جاتا تھا گاہ تھام کے دِل

جوں جوں کرتا تھا ضبط میں نالا
دل ہوا جاتا تھا تہ و بالا

مرغِ بسمل کی میری صورت تھی
یاں گرا، واں گرا، یہ حالت تھی

الغرض پہنچا ساتھ اُن کے وہاں
دفن کا اُس کے، تھا مقام جہاں

قبر کھدتی جو واں نظر آئی
لاکھ روکا پہ چشم بھر آئی

دیکھ کر یہ، جو لوگ رونے لگے ٹکڑے ٹکڑے جگر کے ہونے لگے
طاقتِ ضبطِ گریہ جب نہ رہی دل سے اپنے یہ مَیں نے بات کہی
کہہ کے کیا؟ مَر گئی وہ جان تجھے کچھ وصیّت کا بھی ہے دھیان تجھے؟
ہو نہ لِلّٰہ بے قرار اتنا ضبط کر نالہ، ہو سکے جتنا
دل کو سمجھا کے یہم، گیا مَیں وہاں جمع سب اُس کے اَقربا تھے وہاں
اشک آنکھوں سے گو نہ بہتے تھے لوگ پر دیکھ کر یہ کہتے تھے
حال چہرے کا آج کیسا ہے؟ خیر تو ہے؟ مزاج کیسا ہے؟
لال آنکھیں ہیں، تمتمائے ہیں گال وجہ کیا ہے؟ بیان کی جے حال
منہ پہ اک مُردنی سی چھائی ہے چہرے پر چھٹ رہی ہوائی ہے
بولا مَیں اور کچھ نہیں ہے بات شب کو سویا نہیں مَیں ساری رات
ترکِ عادت بھی اِک عداوت ہے رات کا جاگنا قیامت ہے
دل کا شک اُن کے، سب نکال دیا یہی کہہ سن کے اُن کو ٹال دیا
غُل ہوااِتنے میں، سب آتے جائیں فاتحہ پڑھتے جائیں، جاتے جائیں
سُن کے یہ، سب گئے وہاں احباب بخشا پڑھ پڑھ کے فاتحہ کا ثواب
جب کہ اِس سے بھی ہوگئی فرصت آئے جتنے تھے، ہوگئے رخصت
پائی تنہا جو مَیں نے یار کی قبر دل کو باقی رہی نہ طاقتِ صبر
تھا جو اُس شمع رُو کا پروانہ دوڑ کر آیا مثلِ پروانہ
گر پڑا آکے قبر پر اک بار اور رونے لگا مَیں زار و قطار
نہ رہا تھا جو اختیار میں دل لوٹا تربت پہ صورتِ بسمل
دل عجب کچھ مزا اُٹھاتا تھا قبر اُس کی، گلے لگاتا تھا
مَر گئی تھی جو مجھ پہ وہ گل فام زندگی ہوگئی مجھے بھی حرام
دیکھا آنکھوں سے تھا جو ایسا قہر کھا گیا مَیں بھی گھر میں آکر زہر
دوپہر تک توتَے رہی جاری بعد پھر اُس کے غش ہوا طاری
تین دن تک رہی وہ بے ہوشی ہوگئی جس سے خود فراموشی
عین غفلت میں پھر یہ دیکھا خواب کہ یہ کہتی ہے وہ بہ چشمِ عتاب
سُن تو رِے، تُو نے زہر کیوں کھایا؟ کچھ وصیت کا بھی نہ پاس آیا

ہوئے خود رفتہ ایسے حد سے زِیاد — دو ہی دن میں بھلا دی میری یاد
کہہ کے یہ، جب وہ ہوگئی رُوپوش — کھُل گئی آنکھ، آ گیا مجھے ہوش
زہر کا پھر نہ کچھ اثر پایا — اک تعجب سا مجھ کو یہ آیا
آشنا دوست سب کا تھا یہ بیان — مُردے جی اُٹھے، لو خدا کی شان
ہو گیا والدین کو یہ سُرور — بڑھ گیا دل کا چین، چشم کا نور
اقربا سُن کے سب ہوئے دل شاد — آ کے دینے لگے مبارک باد
حاصل اتنا تھا اِس کہانی سے — ہم رہے جیتے سخت جانی سے
عشق میں ہم نے یہ کمائی کی — دل دِیا، غم سے آشنائی کی

08.08 مثنوی ''زہرِ عشق'' انتخاب: تشریح

اس مثنوی میں جو قصہ مرزا شوقؔ نے نظم کیا ہے۔ وہ بہت ہی صاف وشفاف اور سیدھا وسادہ واقعہ ہے۔ واقعات میں کوئی پیچیدگی اور اُلجھاؤ نہیں۔ عشق ومحبت کا ایک واقعہ ہے جو انسان کے فطری جذبات واحساسات کا آئینہ دار اور درد واثر کا مرقع ہے۔ اس مثنوی میں عاشق ایک خوش حال خاندان کا منچلا نوجوان اور معشوقہ ایک سوداگر کی حسین وجمیل لڑکی ہے۔ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے ہیں۔ ایک دن یہ نوجوان اپنے مکان کی چھت پر چہل قدمی کر رہا تھا کہ اتفاق سے سوداگر کی لڑکی بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے مکان کی چھت پر محوِ خرام تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا نگاہیں چار ہوئیں، تو آتش عشق کا شعلہ بھی بلند ہوا دونوں کے دلوں میں محبت کی آگ جلنے لگی۔ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے دونوں بے چین و بے قرار رہنے لگے۔ لڑکی نے راہ ورسم کے سلسلہ میں پہل کی۔ ماما کے ہاتھ نوجوان کے پاس نامۂ شوق لکھ بھیجا۔ ادھر سے جواب آ گیا۔ یہ سلسلہ بتدریج چلتا رہا۔

پھر ایک بار جمعرات کے دن لڑکی درگاہ حضرت عباس جانے کا بہانہ کر کے ڈولی پر سوار ہو کر گھر سے نکلی اور نوجوان عاشق کے مکان پر پہنچ گئی، ملاقات ہوئی، دل کے حوصلے پورے ہوئے۔ اس طرح کئی بار آنا جانا ہوا تو ایک دن یہ راز فاش ہو گیا، لڑکی کے والدین کو یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کس راہ پر جا رہی ہے۔ اس کے والدین نے یہ طے کیا کہ اس کو کسی عزیز کے یہاں بنارس بھیج دیا جائے۔ مہہ جبیں نامی لڑکی جب اس حال سے باخبر ہوئی تو بدنامی کے خوف اور ندامت سے برا حال ہو گیا ماں باپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ رہی، تب اس نے سوچا کہ اس بدنامی سے تو مر جانا اچھا ہے۔ خودکشی کرنے سے پہلے اپنے عاشق سے آخری ملاقات کرنے کے لئے کسی طرح حیلہ بہانے سے اس کے گھر پہنچ گئی۔ تمام حالات کہہ سنائے اور اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ اس نوجوان کو یہ یقین نہ تھا کہ یہ الّھڑ اور کم سن لڑکی خودکشی کی بھی ہمت کر سکتی ہے، اتنی ہمت اس میں کہاں سے آئی، بہر حال اس کو سمجھایا بجھایا کہ اپنے اس ارادے سے باز آئے۔ ماں باپ کی بات مان لو، ماں باپ کا اولاد پر بڑا حق ہے کیوں خدانخواستہ زہر کھانے کی بات کرتی ہو۔ مگر وہ اپنے ارادے پر اٹل تھی۔

لڑکی نے کچھ وصیّتیں کیں، آخری ملاقات بھی ختم ہوئی اور وہ رخصت ہو کر اپنے گھر پہنچی۔ دوسرے ہی دن نوجوان نے سوداگر کے گھر سے رونے دھونے کی آوازیں سنیں۔ پھر تو بڑا فکرمند ہوا اور اپنے ذرائع سے کھوج بین کی تو معلوم ہوا۔ کہ مہہ جبین نے زہر کھا کر جان دے

دی۔ خلاف توقع خبر سے اس کا برا حال ہوگیا، رنج وغم سے نڈھال ہوگیا لیکن پھر بھی جنازے کے ماتمی جلوس میں شرکت کی اور مہہ جبین کی تدفین کے بعد گھر آ کر اس نے بھی زہر کھا کر خودکشی کا قدم اٹھالیا مگر اس کو کامیابی نہ ہوئی۔ لڑکے پر تین دن تک بے ہوشی طاری رہی اسی حالت میں خواب دیکھا کہ وہ اپنی وصیّت یاد دلا رہی تھی۔ اور وصیّت یاد دلانے کے بعد مہہ جبین تو روپوش ہوگئی۔ اب جب عاشق کو ہوش آیا تو زہر کا کچھ اثر بھی باقی نہیں رہا۔ لوگ اس نوجوان کو مبارک باد دینے لگے۔ اس مثنوی میں مہہ جبین کی وفاداری وجاں نثاری نے اس کے کردار کو زندہ وجاوید بنادیا، لیکن نوا جوان کا کردار کسی حد تک مضحکہ خیز لگتا ہے۔ جرأت وہمت جو مردوں کا جوہر وشعار ہے۔ وہ مہہ جبین کے حصہ میں آیا۔ بزدلی اور پست ہمتی نے نوجوان کے کردار کو داغ دار کیا ہے۔ اس سے مرد کی خودغرضی اور ریاکاری کا اندازہ ہوتا ہے۔

08.09 خلاصہ

اس اکائی میں آپ نے مرزا شوقؔ کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری کے متعلق معلومات حاصل کی۔ زہرِ عشق کے ماخذ، متن اور تجزیہ کو ملاحظہ کیا ہے پھر بھی ہم اک بار طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہر تخلیق کار اپنے زمانے کے حالات پر گہری نظر رکھتا ہے اور وہ اس ماحول کا پروردہ ہوتا ہے۔ ایک شاعر کے ساتھ بھی اس کی اپنی افتادِ طبع، شخصی تجربات، محسوسات اور مشاہدات کی ایک دنیا ہوتی ہے۔ اسی سے وہ اپنا ایوانِ سخن تعمیر کرتا ہے۔ مرزا شوقؔ نے جس عہد میں اپنی آنکھیں کھولی وہ زمانہ اہل لکھنو کے لئے امن وآشتی کا زمانہ تھا۔ شاعروں کی سرپرستی بادشاہ کیا کرتے تھے۔ شعرا انعام واکرام سے نوازے جاتے تھے۔ مرزا شوق آصف الدولہ کے زمانے میں ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ واجد علی شاہ کو مٹیا برج جاتے دیکھا۔ شوق کی طبیعت میں بلا کی جولانی تھی۔ شوق اپنے مزاج سے اپنے ہم عصروں میں بہت مقبول تھے۔ شاعری کا ذوق تھا مگر دیر میں نام کمایا۔ آتشؔ کے شاگرد ہوئے۔ کلام میں کچھ غزلیں، واسوخت اور تین مثنویاں فریبِ عشق، بہارِ عشق اور زہرِ عشق ہیں۔ ان تینوں مثنویوں میں ادبی اعتبار سے سب سے اہم مقام ''زہرِ عشق'' کو حاصل ہے۔ فریبِ عشق مرزا شوقؔ کی پہلی مثنوی ہے۔ جو گلزارِ نسیم کے ٹھیک آٹھ سال بعد لکھی گئی۔ اس مثنوی میں لکھنو کی روزمرہ زندگی کا ایک تاریک پہلو بڑے رنگین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شوق کی دوسری مثنوی بہارِ عشق ہے جو کہ ۱۸۴۷ء میں منظرِ عام پر آئی۔ شوق کے بعض نقادوں نے کہنا ہے کہ زبان ومحاورے اور روزمرّہ کے حساب سے اس مثنوی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مثنوی زہرِ عشق شوقؔ کی تیسری اور معرکۃ الآرا مثنوی ہے۔ جس کو اردو کی چند اہم مثنویوں کے ہم پلہ رکھا جاسکتا ہے۔ اس مثنوی کی تعریف وتنقیص میں اب تک بہت کچھ تحریر کیا جاچکا ہے۔ اس کے باوجود تمام ناقدین ادب کی متفقہ رائے یہ ہے کہ یہ اردو کی ایک اہم مثنوی ہے جسے سحر البیان اور گلزارِ نسیم کے زمرہ میں رکھا جاسکتا ہے۔

08.10 فرہنگ

ابتذال	: ذلیل پن	سم	: زہر
اختلاط	: میل جول	شاہ کار	: بڑا کام
اضطراب	: بےچینی	شعار	: طریقہ، راستہ
ایوان	: مکان، محل	شگوفہ	: کلیاں
بَین	: میت پر رونا	شہرتِ دوام	: دائمی شہرت

تخلیق	: پیدا کی ہوئی، شکل	طبیب حاذق	: ماہر حکیم
تزکیہ نفس	: نفس پاک کرنے والی	عصبیت	: نفرت، تعصب
تسکین نفس	: نفس کو سکون پہنچانے والی	علی الاعلان	: کھلّم کھلاّ
تکمیل	: مکمل ہونا	فارم	: ہیئت، شکل
خفقان	: دل کی دھڑکن، ہول	محزوں	: غمگین، رنجیدہ
خوبرو	: اچھے چہرے والا	مردنی	: کمہلانے کی کیفیت
رغبت	: توجہ، دل چسپی	مضمر	: پوشیدہ، چھپا ہوا
رکاکت	: سستی، بے معنی	مکتوب	: خط
زمزمہ	: نغمہ، گیت	ہجر	: جدائی

08.11 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱۔ مرزا شوقؔ کا تعارف پیش کیجیے؟

سوال نمبر۲۔ مرزا شوقؔ کی شاعری کی ابتدا پر ایک مضمون تحریر کیجیے؟

سوال نمبر۳۔ مرزا شوقؔ کی ''بہارِ عشق اور فریبِ عشق'' کا مختصراً جائزہ لیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱۔ مرزا شوقؔ کے حالات زندگی تحریر کیجیے؟

سوال نمبر۲۔ مثنوی ''زہر عشق'' کے ماخذ پر اپنا موقف واضح کیجیے؟

سوال نمبر۳۔ مثنوی ''زہر عشق'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں پیش کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : ''زہرِ عشق'' کس شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) دیا شنکر نسیمؔ (ب) میر حسنؔ (ج) انشاؔ (د) مرزا شوقؔ

سوال نمبر۲ : مرزا شوقؔ لکھنوی کا اصل نام کیا ہے؟

(الف) نوازش حسین (ب) صادق حسین خاں (ج) تصدق حسین خاں (د) غلام حسین

سوال نمبر۳ : ''علوم'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) عالم (ب) علم (ج) علامہ (د) علمی

سوال نمبر۴ : ''بہارِعشق'' کس شاعر کی مثنوی ہے؟

(الف) مرزاشوقؔ (ب) انشاؔ (ج) میرحسنؔ (د) دیاشنکرنسیمؔ

سوال نمبر۵ : مثنوی ''بہارِعشق'' میں کتنے اشعار ہیں؟

(الف) ۸۰۰/اشعار (ب) ۸۴۲/اشعار (ج) ۸۰۱/اشعار (د) ۸۵۲/اشعار

سوال نمبر۶ : ''تصنیف'' کی جمع کیا ہے؟

(الف) منصف (ب) مصنف (ج) تصانیف (د) صنف

سوال نمبر۷ : ''اختلاف'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) خلف (ب) خلافت (ج) مختلف (د) اتفاق

سوال نمبر۸ : ''عناصر'' کا مترادف لفظ کیا ہے؟

(الف) اَجزا (ب) منصور (ج) ناصر (د) نصیر

سوال نمبر۹ : ''معاون'' کا معنی کیا ہے؟

(الف) کاہل (ب) مددگار (ج) نقصان دہ (د) فتنہ گر

سوال نمبر۱۰ : ''مثنوی زہرِعشق'' کی ہیروئن کا نام کیا ہے؟

(الف) ماہ رُخ (ب) بکاؤلی (ج) مہ جبین (د) حُسن آرا

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (د) مرزاشوقؔ

جواب نمبر۲ : (ج) تصدق حسین خاں

جواب نمبر۳ : (ب) علم

جواب نمبر۴ : (الف) مرزاشوقؔ

جواب نمبر۵ : (ب) ۸۴۲/ اشعار

جواب نمبر۶ : (ج) تصانیف

جواب نمبر۷ : د) اتفاق

جواب نمبر۸ : (الف) اَجزا

جواب نمبر۹ : (ب) مددگار

جواب نمبر۱۰ : (ج) مہ جبین

08.12 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو مثنوی شمالی ہند میں از ڈاکٹر گیان چند جین

۲۔ شمالی ہند میں اردو مثنوی کا ارتقا از سید محمد عقیل

۳۔ مثنویات شوق از رشید حسن خاں

۴۔ مثنویات اردو از منشی امیر احمد علوی

۵۔ تذکرۂ شوق از عطاء اللہ پالوی

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar
Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232
www.uou.ac.in email: info@uou.ac.in
Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

MAUL - 603-1(004132)